اکتوبر 2013، قیمت -/10

ماهنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly **BACHON KI DUNIYA**, New Delhi

حج مبارک

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

جلد:1 شمارہ:5 اکتوبر 2013

مدیر اعلیٰ: ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین

نائب مدیر: ڈاکٹر عبدالحی

اعزازی مدیر: نصرت ظہیر

ناشر اور طابع:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی-88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت-/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

■ اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

صدر دفتر
فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبۂ ادارت 'بچوں کی دنیا': 49539011

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncupul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبۂ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت
فون: 26109746
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی-110066
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 040 - 24415194

اس شمارے میں

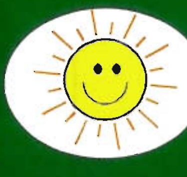

مدیر کا خط	آپس کی باتیں	مدیر	2
حج کے موقع پر	تیری سرکار میں پہنچے تو...	نصرت ظہیر	3
UN کی سال گرہ	ایک ہے اقوام متحدہ	ثمینہ پروین	5
گاندھی جینتی	گاندھی جی کا بچپن	ادارہ	8
نظم	چچا غالب خواب میں	ظفر گورکھپوری	9
کہانیاں	سورج پاس ہوگیا	رتن سنگھ	10
	سورج پر پہرا	فرزانہ اسد	12
نظمیں	سورج	رئیس الدین رئیس	14
	سورج	محسن باعشن حسرت	15
کہانیاں	نیا قصہ چار درویش	راحت روش	16
سچی کہانیاں	چالاک چوہے	اطہر رضا بلگرامی	20
	بڑا آدمی	ایم آئی ساجد	22
نظم کہانی	لالچ کی سزا	خلیق الزماں نصرت	24
کامکس کہانیاں	ایمان داری کا انعام، بے ایمانی کا انجام		25
نظم	سوچو بغیران کے	عبدالنصیر	31
مضمون	ڈاکیہ ڈاک لایا	مجید بیدار	32
	پتنگ	بانو سرتاج	36
نظم	باغ میں پھول ہیں کھلے	متین اچل پوری	41
مضمون	پانی رے پانی	شمیم احمد صدیقی	42
نظم	پرندوں کی جنت	خاور نقیب	44
اس مہینے کی باتیں	اکتوبر	ادارہ	45
نانی کا صندوق	یہ دنیا گول ہے	کہانی	51
	نانی تیری مورنی کو...	شیلندر	53
قسط وار ناول	اسّی دن کا سفر 5	جولز ورنے	54
کھیل کھلاڑی	بیس بال	شبنم پروین	61
آپ کی باتیں	اردو فیس بک	بچوں کے پیغام	64

آپس کی باتیں!

عزیز دوستو، 'بچوں کی دنیا' میں ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی آپ کے پڑھنے کے لیے بہت کچھ ہے جس سے نہ صرف معلومات بڑھے گی بلکہ آپ کو لطف بھی آئے گا۔ شروعات ہورہی ہے، فریضۂ حج کے ذکر سے جس کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور جسے اس زمین پر ہر سال ہونے والے سب سے بڑے مذہبی اجتماع کا رتبہ حاصل ہے۔ مذہب اسلام میں حج کو فرض کا درجہ دیا گیا ہے، چنانچہ دنیا بھر سے لاکھوں مسلمان اس موقع پر مقدس شہر مکّہ میں جمع ہوتے ہیں اور یہ فرض ادا کرتے ہیں۔

جس طرح حج ساری دنیا کے مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جوڑتا اور ملاتا ہے اسی طرح دنیا بھر کے ملکوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے لیے آج سے 68 برس پہلے ایک عالمی پنچایت بنائی گئی تھی جس کا نام اقوام متحدہ ہے۔ اس ادارے کو قائم کرنے کا اصل مقصد دنیا کو جنگوں سے بچانا تھا۔ اس مقصد میں تو یہ ادارہ پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکا کیونکہ اس کے کئی ممبر ملکوں میں آپس میں ہی کئی جنگیں ہوچکی ہیں، لیکن زندگی کے دوسرے کئی معاملوں میں، مثلاً تعلیم، صحت، اس زمین کے ماحول کو صاف ستھرا بنانے اور تاریخی یادگاروں کو بچانے کے سلسلے میں یہ ادارہ اچھے کام کررہا ہے۔ اس اہم ادارے کی سالگرہ بھی اسی مہینے ہے، لہٰذا ایک مضمون اس بارے میں بھی ہے جو امید ہے آپ کو پسند آئے گا۔ اور ہاں، اکتوبر کا مہینہ آئے تو ہم اپنے پیارے گاندھی جی کو کیسے بھول سکتے ہیں۔ ان کے بارے میں ایک مختصر مضمون اس شمارے میں شامل ہے جس میں باپو کے بچپن کی کئی دل چسپ باتیں آپ پڑھیں گے۔

کہانیوں میں اس بار کئی مزے کے قصے شامل ہیں۔ 'سورج پاس ہوگیا' بڑی دل چسپ کہانی ہے جو اردو کے مشہور و معروف افسانہ نگار جناب رتن سنگھ نے لکھی ہے۔ اتفاق سے اس مرتبہ ہمیں ایک اور کہانی 'سورج' کے تعلق سے موصول ہوئی۔ نظموں کی فائل کھولی تو اس میں بھی دو نظمیں سورج کے بارے میں نکل آئیں۔ تب ہم نے سوچا کیوں نہ یہ سب چیزیں ایک ساتھ شامل کرلی جائیں۔ اب یہ ایک اچھا خاصا سورج کا گوشہ بن گیا ہے۔ 'چالاک چوہے' کے مصنف پروفیسر اطہر رضا بلگرامی معاشیات کے استاد ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ جو دو حیرت انگیز واقعے انھوں نے چوہوں کی عقل مندی کے بیان کیے ہیں وہ بالکل سچّے اور ان کے چشم دید ہیں۔ اب ہم پروفیسر صاحب کی بات کو جھٹلا تو نہیں سکتے لیکن خود ہماری اب تک ایسے چالاک چوہوں سے ملاقات نہیں ہوئی ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے، ہمیں ضرور لکھیے گا۔ چچا غالب پر ایک بڑی خوب صورت نظم ظفر گورکھ پوری نے آپ کے لیے بھیجی ہے۔ 'نانی کے صندوق سے' بھی اس مرتبہ ایک بڑی ہی پیاری نظم ہمیں ملی ہے جسے ہم تو بچپن سے سنتے آئے ہیں، ہوسکتا ہے آپ نے بھی کہیں پڑھی یا سنی ہو۔ جولز ورنے کے ناول 'اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز' (80 دن میں دنیا کا سفر) کے مسٹر فوگ اور ان کا دل چسپ خادم پاسپرٹو اب ہندوستان پہنچ گئے ہیں اور یہاں طرح طرح کے حیرت انگیز واقعات ان کے منتظر ہیں۔

یہ اور دوسری کئی دل چسپ تحریریں آئندہ صفحات پر آپ کا انتظار کررہی ہیں۔ انھیں پڑھ کر اپنی پسند ناپسند کے بارے میں ہمیں ضرور لکھیے گا۔ آپ کا،

(ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین)

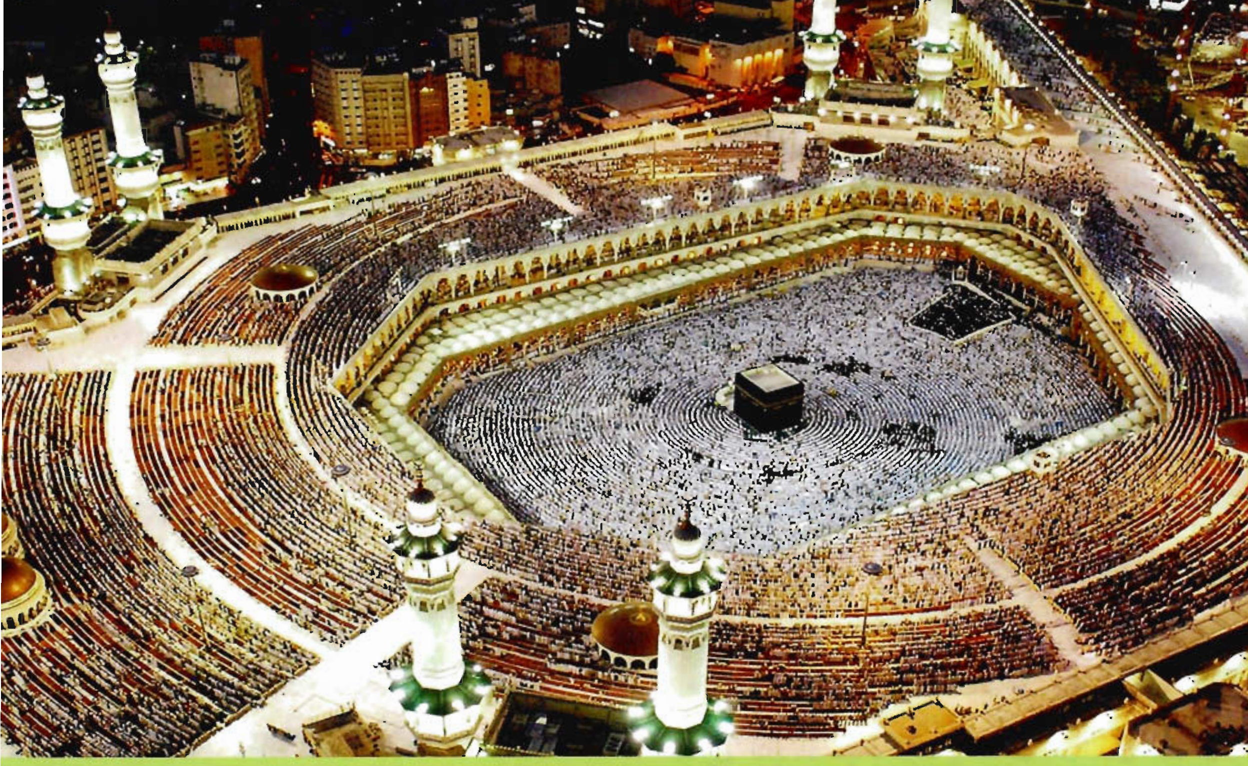

تیری سرکار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے

پیارے بچّو حج کا مہینہ آگیا ہے اور ہر سال کی طرح اس مرتبہ بھی دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان عرب کے قدیم اور مقدس شہر مکّہ میں جمع ہو کر حج کا فرض ادا کریں گے جو مذہب اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں شامل ہے۔ یہ پانچ ارکان ہیں کلمہ توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

بچّو حج ہر سال اس زمین پر ہونے والا دنیا کا سب سے بڑا عوامی اجتماع ہے۔ یعنی، اتنے زیادہ لوگ ہر سال کہیں جمع نہیں ہوتے جتنے حج کے موقع پر مکّہ شہر میں ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد اب اوسطاً تیس لاکھ سے اوپر ہوتی جس میں لگاتار ہر سال اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ پچھلے سال یعنی 2012 میں سعودی عرب کی حکومت کے حساب کتاب کے مطابق 3,161,573 مسلمانوں نے حج کیا تھا جن میں سے کل ملا کر 1,408,641 سعودی باشندے تھے اور باقی 1,752,932 دنیا بھر کے ملکوں سے آئے تھے۔

اگرچہ دنیا کے سب سے بڑے مذہبی اور انسانی اجتماع کا اعزاز ہندوستان میں ہونے والے کنبھ کے میلوں کو جاتا ہے جو ہردوار، پریاگ (الہ آباد) ناسک اور اجین میں ہوتے ہیں لیکن یہ ہر سال نہیں ہوا کرتے۔ اردھ کمبھ 6 سال بعد اور مہا کمبھ 12 سال بعد ہوتے ہیں اور ان میں کروڑوں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ اس سال الہ آباد میں جو مہا کمبھ ہوا تھا اس میں کل ملا کر 10 کروڑ زائرین نے حصہ لیا تھا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی ایک دن وہاں اتنے زائرین موجود تھے۔ لوگ آتے رہے اور جاتے رہے۔ پھر بھی کل ملا کر یہ انسانی تاریخ کا اب تک کا سب سے بڑا انسانی اجتماع تھا۔

حج کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ہر سال ہوتا ہے اور کم و بیش ڈیڑھ ہزار سال سے یہ سلسلہ یوں ہی چلا آ رہا ہے۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ ہر عاقل اور بالغ اور مسلمان پر زندگی میں ایک بار حج کرنا فرض ہے۔

مسلمانوں نے سب سے پہلا حج پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰؐ کی قیادت میں 630 عیسوی میں یعنی تقریباً 14 سو برس پہلے کیا تھا۔ لیکن کعبہ کے اطراف عربوں کے سالانہ اجتماع کی روایت ہزاروں سال پہلے حضرت ابراہیمؑ کے زمانے سے چلی آ رہی ہے، جنھوں نے

▲ عازمین حج عرفات کی پہاڑیوں پر

خانۂ کعبہ کی بنیاد رکھی تھی۔ روایت ہے کہ اس وقت یہاں پانی نہیں تھا۔ حضرت ابراہیم کے بیٹے حضرت اسماعیل کی والدہ حضرت ہاجرہ ایک مرتبہ پیاس سے نڈھال اپنے بیٹے کے لیے پانی کی تلاش میں صفا ور مروا کی پہاڑیوں کے بیچ دوڑتی رہیں اور اس طرح انھوں نے سات چکّر لگائے مگر پانی نہیں ملا۔ واپس پیاسے فرزند کے پاس آئیں تو دیکھا ننھے اسماعیل کے پاؤں کی ضرب سے وہاں ایک پانی کا چشمہ ابل پڑا تھا۔ اس چشمے کا نام زم زم پڑ گیا اور یہ آج بھی مکہ کے لاکھوں لوگوں کی پیاس بجھاتا ہے۔ اس یاد کو تازہ رکھتے ہوئے مسلمان حج کے دوران صفا اور مروا کے درمیان اسی راستے پر سات مرتبہ دوڑ کر یا تیز قدمی سے آتے اور جاتے ہیں۔ حج کے اس رکن کو سعی کہا جاتا ہے۔

حج کے ارکان میں جانوروں کی قربانی بھی شامل ہے اور اس کا سلسلہ بھی حضرت ابراہیم اور ان کے فرزند حضرت اسماعیل سے جا ملتا ہے۔ روایت کے مطابق حضرت ابراہیم کو جن کا یہودی اور عیسائی بھی بے حد احترام کرتے ہیں خدا کا حکم آیا کہ وہ خدا کی راہ میں اپنے بیٹے حضرت اسماعیل کو قربان کر دیں جن سے وہ بے حد محبت کرتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے انھیں حکم خداوندی کے بارے میں بتایا تو وہ خوشی سے اپنی قربانی کے لیے نہ صرف تیار ہو گئے بلکہ والد کی ہمّت بھی بڑھاتے رہے۔ آخر حضرت ابراہیم نے فرزند کے گلے پر چھری چلائی تو خدا کو ان کی یہ ادا بہت پسند آئی اور اس کے حکم سے وہاں حضرت اسماعیل کی جگہ ایک بھیڑ کی قربانی ہو گئی۔ اس واقعے سے حضرت اسماعیل بھی خدا پرستی اور فرماں برداری کی ایک بڑی علامت بن گئے مسلمان انھیں ذبیح اللہ کے لقب سے یاد کرتے ہیں اور اس واقعے کی یاد میں عید الاضحیٰ کے دن جانور کی قربانی دیتے ہیں۔ یہ عید حج کے موقع پر ہی آتی ہے اور حج کے بنیادی ارکان ادا کرنے بعد جانور کی قربانی کے ساتھ حج مکمل ہوتا ہے۔

حج کی سب سے خاص بات یہ ہے کہ یہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو ایک ہونے کا موقع دیتا ہے۔ حج کرنے والے تمام مسلمان چاہے جس ملک قوم رنگ نسل اور زبان سے تعلق رکھتے ہوں ان کی سماجی حیثیت چاہے جو بھی ہو کعبے کے طواف میں، نماز میں، سعی میں اور باقی سبھی ارکان کی ادائیگی میں ان کا درجہ اور مقام برابری کا ہوتا۔ سبھی مرد حاجی ایک جیسا احرام باندھتے ہیں۔ مسجد حرم میں جب لاکھوں سر ایک ساتھ خدا کے سامنے رکوع اور سجدے کے لیے جھکتے ہیں تو ایک عجیب روح پرور سماں ہوتا ہے جس کی مثال دنیا میں نہیں ملتی! □ نصرت ظہیر

ثمینہ پروین

بچو! تم نے اقوام متحدہ یا یواین UN کا نام ضرور سنا ہوگا۔ اقوام دراصل قوم کی جمع ہے اور متحدہ کا مطلب ہے مل جل کر یا اکٹھے رہنا۔ انگریزی میں متحدہ کو یونائٹڈ United اور اقوام کو نیشنز Nations کہتے ہیں۔ تو بس یوں سمجھ لو کہ اقوام متحدہ دنیا بھر کے ملکوں یا قوموں کی تنظیم یعنی جماعت ہے۔ جیسے گاؤں میں الگ الگ برادریوں کی ایک پنچایت ہوتی ہے اس طرح اقوام متحدہ سبھی براعظموں میں پھیلے ہوئے ملکوں کی پنچایت ہے جہاں آپس کے جھگڑے سلجھائے جاتے ہیں دنیا کے سامنے آنے والی مشکلوں کے حل ڈھونڈے جاتے ہیں اور انسانوں کی ترقی کے منصوبے بھی بنائے جاتے ہیں۔

اب تم پوچھو گے کہ اس پنچایت کو بنانے کی کیا ضرورت پیش آئی؟ اس کا بالکل سامنے کا جواب یہ ہے کہ پچھلی صدی کے پہلے پچاس برسوں میں دو عالمی جنگوں سے جن میں درجنوں ملکوں نے حصہ لیا تھا اتنی خوں ریزی ہوئی کہ کروڑوں لوگ مارے گئے اور ایسے ایسے خطرناک ہتھیار بنا لیے گئے کہ دنیا کا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ سمجھ دار لوگوں نے پیشین گوئی کی کہ اگر تیسری عالمی جنگ ہوئی تو وہ اتنی بھیانک ہوگی کہ پوری دنیا تباہ ہو جائے گی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد اگرچہ لیگ آف نیشنز کے نام سے ملکوں کی ایک تنظیم بنا لی گئی تھی لیکن یہ اتنی کمزور ثابت ہوئی کہ دوسری عالمی جنگ کو نہ روک سکی۔

ان حالات میں 25 اپریل 1945 سے 26 جون 1945ء تک سان فرانسسکو، امریکہ میں پچاس ملکوں کے نمائندوں کی ایک کانفرس ہوئی۔ اس کانفرس میں ایک بین الاقوامی یا انٹرنیشنل ادارہ قائم کرنے پر غور کیا گیا جو آپس کے جھگڑوں کو جنگ میں تبدیل ہونے سے روک سکے۔ طے کیا گیا کہ اس تنظیم کا نام اقوام متحدہ ہوگا۔ چنانچہ اقوام متحدہ یا Nations United کا منشور یا چارٹر مرتب کیا گیا۔ اور اقوام متحدہ 24 اکتوبر 1945 کو وجود میں آگئی۔

اقوام متحدہ یا اس کے چارٹر میں لکھا ہے:

ہم اقوام متحدہ کے ممبر ملکوں کے عوام نے پختہ ارادہ کیا ہے کہ آنے والی نسلوں کو جنگ کی لعنت سے بچائیں گے جو ہماری زندگی میں انسانی نسل پر دو مرتبہ بے انتہا مصیبتیں لا چکی ہے۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کو تسلیم کرایا جائے گا، اور ہم انسانی قدروں کی عزت اور کریں گے۔ مرد اور عورت کے حقوق برابر ہوں گے۔ اور چھوٹی بڑی قوموں کے حق بھی برابر کے ہوں گے۔ ایسے حالات پیدا کریں گے کہ عہد ناموں اور بین الاقوامی آئین کی ذمہ داریوں کو نبھایا جائے۔ آزادی کی ایک کھلی فضا میں سب کی ترقی کی رفتار بڑھے اور زندگی کا معیار بلند ہو۔ ان مقصدوں کو حاصل کرنے کے لیے رواداری اپنائیں۔ پڑوسی ملکوں کے ساتھ امن چین سے رہیں۔ بین الاقوامی امن اور سلامتی کی خاطر اپنی طاقتوں کو متحد کریں۔ اصولوں اور روایتوں کو قبول کریں اور اس بات کا یقین دلائیں کہ طاقت کا استعمال ہمیشہ سب کے فائدے کے لیے کیا جائے گا۔ دنیا کی تمام قوموں کی اقتصادی اور اجتماعی ترقی کے لیے بین الاقوامی ذرائع استعمال کریں۔

اس چارٹر میں حالانکہ سبھی ملکوں کو برابری کا درجہ دیا گیا تھا لیکن یو این کے ڈھانچے میں ہر سطح پر یہ برابری نہیں رکھی گئی۔ طاقت ور ملکوں کو

خاص درجہ دیا گیا جواب بھی برقرار ہے۔

بہر حال اقوام متحدہ مختلف سطحوں پر دنیا میں امن اور خوش حالی کے لیے کام کرتی ہے۔ اس کے 6 حصے ہیں:

پہلا ہے جنرل اسمبلی۔ یہی وہ عام پنچایت ہے جس میں سب ملکوں کا برابر کا درجہ ہے۔

اس کے بعد آتی ہے پندرہ ملکوں کی سلامتی کونسل یا سیکورٹی کونسل۔ اس کے دس ممبر چناؤ کے ذریعے ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ باقی پانچ ممبر دنیا کے وہ پانچ طاقت ور ملک ہیں جو کبھی نہیں بدلتے۔ یہ مستقل ممبر ہیں امریکہ، برطانیہ، فرانس، روس اور چین۔ یہ ملک یا ان میں سے کوئی بھی ملک جنگ اور سلامتی سے متعلق اس کونسل کے یا جنرل اسمبلی کے ملکوں کی اکثریت کے کسی بھی فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ اسے ویٹو پاور کہتے ہیں۔ یہ طاقت اقوام متحدہ کے کسی اور ملک کو حاصل نہیں ہے۔ اس میں چین کا قصہ بڑا دل چسپ ہے۔ جس وقت اقوام متحدہ بنی تھی تب چین آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک تھا (آج بھی ہے) لیکن وہاں کمیونسٹ حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ چند سال بعد کمیونسٹ حکومت آئی تو اس نے جنرل چیانگ کائی شیک کی حکومت کو وہاں سے بھگا دیا، اور جنرل نے اپنی فوج کی مدد سے چین کے ایک جزیرے تائیوان پر قبضہ کر کے اسے اپنی حکومت کا ہیڈکوارٹر بنالیا۔ امریکہ اور اس کے ساتھی ملکوں نے چین کی نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اب یہ ذرا سا ملک تائیوان سلامتی کونسل میں جائنا ری پبلک کے نام سے مستقل ممبری پر ڈٹا رہا اور اس کے پاس ویٹو پاور بھی رہی۔ اس طرح اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل ایک اچھا خاصا مذاق بن گئی۔ تب ہندوستان نے کمیونسٹ چین کو مستقل ممبر شپ دینے کے لیے آواز اٹھائی اور آخر ایک لمبی جدوجہد کے بعد جس کے دوران چین ایک ایٹمی طاقت بھی بن گیا تھا، ہندوستان کی کوششیں رنگ لائیں اور تائیوان کی جگہ اصلی چین کو مستقل ممبر شپ مل گئی۔ مگر بچو افسوس کی بات یہ ہے کہ چین نے ہندوستان کے اس احسان کو کبھی اہمیت نہیں دی۔

خیر اس کے بعد نمبر آتا ہے اقتصادی اور سماجی معاملوں کی کونسل کا جو اکونومک اینڈ سوشل کونسل کہلاتی ہے، اس کے 54 ممبر ہوتے ہیں جنھیں

جنرل اسمبلی تین سال کے لیے چنتی ہے اور یہ ملک مل کر دنیا بھر کے اقتصادی اور سماجی ترقی کے معاملات کے بارے میں فیصلے کرتے ہیں۔

چوتھا ادارہ ہے بین الاقوامی عدالت یا انٹرنیشنل کورٹ۔ یہ عدالت ملکوں کے باہمی تنازعات کو قانونی طور سے سلجھاتی اور اپنے فیصلے سناتی ہے۔ اس کا صدر دفتر ہیگ (نیدر لینڈ) میں ہے۔

پانچواں ادارہ سکریٹریٹ کا ہے جس کا صدر دفتر نیویارک میں ہے اور اس میں اقوام متحدہ کے انتظامی معاملات دیکھے جاتے ہیں۔ سکریٹری جنرل کا دفتر بھی اسی میں ہوتا ہے جو تنظیم کا انتہائی اہم عہدہ ہے۔ چھٹا ادارہ یو این ٹرسٹی شپ کونسل کا ہے لیکن یہ اب کوئی کام نہیں کرتا۔

اس کے علاوہ بھی اقوام متحدہ کے کئی ادارے ہیں۔ ان میں ایک ہے United Nations Permanent Forum on Indigenous Issues یعنی قوموں کے مخصوص معاملات پر غور کرنے والا مستقل ادارہ۔ اس میں دنیا کی مختلف آبادیوں کے اپنی نوعیت کے الگ معاملوں پر غور کرنے کے علاوہ دوسرے اداروں سے تال میل رکھنے کا کام بھی کیا جاتا ہے۔

اقوام متحدہ کی خاص ایجنسیاں دنیا کے الگ الگ معاملوں کو دیکھتی ہیں۔ جیسے International Atomic Energy Agency یعنی ایٹمی توانائی کی بین الاقوامی ایجنسی، Food and Agriculture Organization یعنی خوراک اور زراعت کی

ایجنسی، یونیسکو UNESCO جو کہ United Nations Educational, Scientific and Cultural Organization کا مختصر نام ہے۔ World Health Organization یا عالمی صحت تنظیم۔ اور World Bank یعنی عالمی بنک۔ بچوں نوجوانوں بزرگوں اور عورتوں کے حالات کی بہتری کے بھی کئی ادارے کام کرتے ہیں۔

اقوام متحدہ کی چھ آفیشیل زبانیں ہیں انگریزی، چینی، فرنچ ،اسپینش، عربی اور روسی۔ قیام کے وقت 51 ملک اس کے ممبر تھے۔ آج 193 ہیں۔ ناروے کے ٹریگوے لائی، سویڈن کے ڈاگ ہیمر شولڈ، برما کے یوتھانٹ، آسٹریا کے کرٹ والڈھائم، پیرو کے زیوئیر پیریز ڈی کویلر، مصر کے بطرس بطرس غالی، گھانا کے کوفی عنان اب تک اس کے سات سکریٹری جنرل رہ چکے ہیں۔ جنوبی کوریا کے موجودہ بان کی مون آٹھویں ہیں۔

بچّو اقوام متحدہ ایک اہم ادارہ ضرور ہے لیکن یہ جنگوں کو روکنے کے اپنے اصل مقصد میں ابھی کچھ خاص کامیاب نہیں ہوا ہے۔ ویت نام سے لے کر عرب اسرائیل، ایران عراق اور افغانستان کی جنگوں تک کسی جنگ کو یہ روک نہیں پایا ہے۔ اس کی کوئی بڑی کامیابی اگر ہے تو صرف یہ ہے کہ اس کے قائم ہونے سے لے کر اب تک تیسری عالمی جنگ نہیں ہوئی ہے۔ ایٹم بم بنانے والی طاقتیں آج پہلے سے تعداد میں زیادہ ہیں۔ لیکن اقوام متحدہ کچھ حد تک پوری دنیا کو یہ سمجھانے میں ضرور کامیاب رہی ہے کہ جنگیں تباہی لاتی ہیں، عام لوگوں کی مصیبتیں بڑھاتی ہیں، ترقی اور خوش حالی کے راستوں کو بند کرتی ہیں اور قوموں کو زیادہ سے زیادہ ہتھیار حاصل کرنے بڑی سے بڑی فوج کھڑی کر دینے اور دوسروں سے بڑی فوجی طاقت بننے کی ایک ایسی اندھی دوڑ میں دھکیل دیتی ہیں جس سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔ آخر میں عالمی امن کی حمایت میں سب سے اچھی نظمیں کہنے والے بیسویں صدی کے مقبول شاعر ساحر لدھیانوی کی ایک نظم پر ہم یہ مضمون ختم کرتے ہیں جس کے بند تمھیں اچھی طرح یاد کر لینے چاہئیں کیونکہ انسانیت کی نجات امن میں ہے جنگوں میں نہیں۔ ساحر کہتے ہیں:

خون اپنا ہو یا پرایا ہو
نسلِ آدم کا خون کا ہے آخر
جنگ مشرق میں ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر

ٹینک آگے بڑھیں کہ پیچھے ہٹیں
کوکھ دھرتی کی بانجھ ہوتی ہے
فتح کا جشن ہو کہ ہار کا سوگ
زندگی میّتوں پہ روتی ہے

جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ کیا مسئلوں کا حل دے گی
آگ اور خون آج دیتی ہے
بھوک اور احتیاج کل دے گی

اس لیے اے شریف انسانو!
جنگ ٹلتی رہے تو بہتر ہے
آپ اور ہم سبھی کے آنگن میں
شمع جلتی رہے تو بہتر ہے

◆ ثمینہ پروین، دارالسلام، ڈی پی ایس، ریاض، سعودی عرب

گاندھی جی کا بچپن

گاندھی جی کا پورا نام موہن داس کرم چند تھا۔ وہ گجرات کے پور بندر میں 2 اکتوبر 1869 کو پیدا ہوئے۔ گجراتیوں میں رواج ہے کہ بیٹے کے نام کے ساتھ والد کا نام بھی جوڑا جاتا ہے۔ ان کے والد کرم چند جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور خاصے مذہبی اور بااصول آدمی تھے۔ لیکن گاندھی جی پر زیادہ اثر ان کی والدہ پتلی بائی کا تھا جو ایک سیدھی سادی مذہبی خاتون تھیں۔

وہ کرشن جی مہاراج کی پوجا کرتی تھیں اور گجرات کے پرنامی فرقے سے تعلق رکھتی تھیں جس کی سوچ پر ہندو مت اور مذہب اسلام دونوں کا گہرا اثر تھا۔ اس فرقے کے لوگ وید پُران اور قرآن دونوں کا احترام کرتے تھے۔

پرنامیوں کے مندر میں دونوں مذہبوں کی مقدس کتابیں رکھی جاتی تھیں اور پجاری دونوں کتابوں سے حوالے دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کاٹھیاواڑ میں ہندو مسلمان پارسی (زوراشٹرین یا زرتشتی) اور عیسائی بہت ملاپ سے رہتے تھے۔ گاندھی کی شخصیت پر اس مذہبی میل ملاپ کا بہت اثر پڑا۔

مگر بچپن میں گاندھی جی شرارتی بھی بہت تھے۔ اکثر پیار سے اپنی والدہ کی سادہ لوحی اور مذہب پرستی اور آئے دن برت یا اپ واس رکھتے رہنے کا مذاق اڑاتے رہتے۔ ڈرپوک بھی وہ کافی تھے۔ بھوت پریت کی باتوں سے کافی سہمے رہتے تھے۔ ایسے میں ان کی دیکھ بھال

کرنے والی خادمہ رمبھا انھیں رام نام جپنے کو کہا کرتی۔ تین سال کی عمر میں ہی وہ ایسی اچھل کود مچاتے تھے کہ رمبھا کی نظر بچا کر کبھی کبھی مندر کے احاطے میں پہنچ جاتے، کبھی پیڑ پر چڑھ جاتے اور کبھی کنویں میں جھانکنے لگتے۔ رمبھا پیچھے بھاگتی رہتی تھی۔ مگر گاندھی جی کہاں باز آنے والے۔ اپنی بڑی بہن رالیت بین کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ والد سے شکایت کی جاتی تو وہ بھی کہتے کہ یہ کسی کے قابو میں آنے والا نہیں بس اس پر نظر رکھا کرو کہ کہاں آتا ہے کہاں جاتا ہے۔

تمام شرارتوں کے باوجود ایک خاص بات ان میں یہ تھی کہ جھوٹ کبھی نہیں بولتے تھے۔ اسکول میں ایک دفعہ باہر کے لوگ معائنہ کرنے آئے۔ انھوں نے انگریزی لفظ کیٹل Kettle کا غلط املا لکھ دیا کلاس ٹیچر قریب کھڑے تھے۔ انھوں نے ایک اور لڑکے کی سلیٹ پر لکھا ہوا صحیح املا انھیں دکھایا اور نقل کرنے کو کہا۔ مگر گاندھی جی نے یہ بات نہیں مانی اور سچائی پر قائم رہے۔ ایک اور مرتبہ انھوں نے کسی کی ضرورت پوری کرنے کے لیے گھر میں چوری کی لیکن بعد میں بہت پچھتائے اور جب تک اپنے والد کو ایک خط لکھ کر اس چوری کا اعتراف نہیں کر لیا تب تک انھیں چین نہیں آیا۔ یہ خط پڑھ کر ان کے والد رونے لگے تھے۔

ان کا ڈرپوک پن والدہ کی ایک حرکت سے دور ہوا۔ والدہ کے پاؤں پر ایک بچھو چڑھ آیا تھا۔ مگر والدہ نے گھبرانے کی بجائے اطمینان سے بچھو کو چٹکی میں پکڑا اور اسے مارے بغیر کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ اس سے گاندھی جی نے دو سبق سیکھے۔ ایک تو کسی سے ڈرنا نہیں چاہئے۔ دوسرے کسی کی جان نہیں لینی چاہئے۔ یہ اہنسا یا عدم تشدد کا پہلا سبق تھا جس نے گاندھی جی کو بے پناہ طاقت دی اور بڑے ہوکر انھوں نے انگریز حکومت کو کسی انگریزوں کا خون بہائے بغیر بچھو کی طرح عدم تشدد کی چٹکی سے پکڑ کر کھڑکی سے باہر پھینک دیا اور ملک کو آزاد کرا دیا! □

نظم

ظفر گورکھپوری

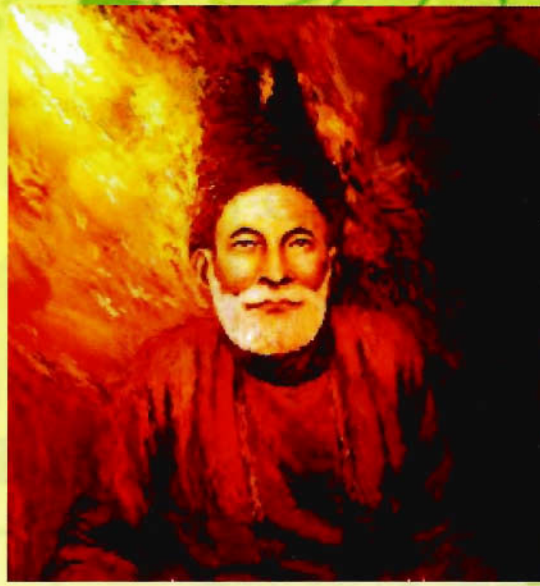

چچا غالب خواب میں

گھنی داڑھی، چمک آنکھوں میں، کچھ شرمائے شرمائے
مجھے کل خواب میں امی چچا غالب نظر آئے
کہا میں نے چچا تسلیم! بولے خوش رہو بیٹا
کہاں تک کی ترقی پڑھنے لکھنے میں کہو بیٹا
کہا میں نے ابھی پہنچا ہوں بارہ امتحانوں تک
وہ بولے اے میاں جانا ہے تم کو آسمانوں تک
کہا میں نے چچا شاعر بنوں گا میں بھی تم جیسا
ذرا تم رائے تو دینا ارادہ ہے مرا کیسا
انھوں نے ہنس کے فرمایا، میاں شاباش! کیا کہنا
لگن دل میں اگر جاگے تو پھر خاموش کیوں رہنا
بنو شاعر، لکھو نغمے محبت کے، شرافت کے
ترانے زندگی کے گیت انسانوں کی عظمت کے
لکھو ہم کو دھنک کے خوشنما رنگوں سے الفت ہے
ستاروں کی چمک، پھولوں کی خوشبو سے محبت ہے
یہ دنیا یہ حسیں دنیا، نظاروں سے بھری دنیا
پہاڑوں ، ندیوں اور آبشاروں سے بھری دنیا
ہم اس دنیا کا رنگ و روپ کم ہونے نہیں دیں گے
کسی صورت اسے ویران ہم ہونے نہیں دیں گے
ہم انساں کی مقدس دوستی پر جان دیتے ہیں
اندھیروں پر نہیں ہم روشنی پر جان دیتے ہیں
لکھو ہندوستاں کے ہم ہیں اور ہندوستاں اپنا
فقط ہندوستاں کی بات کیا سارا جہاں اپنا
میاں منّے عطا ہو تم کو ہر مشکل میں آسانی
خدا تم کو بڑا کردے، بنو تم غالبِ ثانی
بس اب جاؤ کہ حوریں دیکھتی ہوں گی مرا رستہ
سحر ہونے کو ہے لو ہاتھ میں اسکول کا بستہ
اگر ممکن ہو پھر آنا تو اک تکلیف فرمانا
ہمارے واسطے دو چار میٹھے آم لے آنا

ظفر گورکھپوری، A-302، فلوریڈا، شاستری نگر، اندھیری (ویسٹ) بمبئی۔400053

رتن سنگھ

سورج پاس ہوگیا

کچھ دن پہلے کی ہی بات ہے۔

آسمان کا سورج صبح جاگا تو یہ دیکھ کر ڈر گیا کہ دھرتی کے ساتھ گھومتا ہوا سمندر، دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ دھرتی اس کے قریب آتی تھی۔ لیکن سمندر اس سے دور ہی رہتا تھا۔

''اگر یہ تھوڑا اور آگے بڑھا تو میں اس میں ڈوب جاؤں گا۔ میری تو ہستی مٹ جائے گی۔ تو کیا میں اپنے آپ کو بچانے کے لئے پیچھے ہٹوں؟''

''نہیں پیچھے ہٹنا میرا دھرم نہیں۔ یہ تو پرماتما کے حکم کو نہ ماننے والی بات ہو جائے گی۔ پرماتما نے کہا تھا میں ایک جگہ ٹک کر کھڑا رہوں۔ کھڑے رہو اور تپتے رہو، لگاتار۔''

''میں پیچھے ہٹا تو دھرتی کو نہ دھوپ ملے گی اور نہ روشنی۔ اگر ایسا ہوا تو پھول نہیں کھلیں گے۔ فصلیں نہیں پکیں گی۔ اناج ہی نہ پیدا ہوا تو لوگ کھائیں گے کیا؟'' سوچتے سوچتے سورج کے چہرے پر فکر کی لکیریں ابھر آئیں۔ میں کیا کروں؟ سورج کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس آفت سے کیسے بچا جائے؟

اس نے ایک مرتبہ پھر اپنی طرف بڑھتے ہوئے سمندر کی جانب دیکھا۔ وہ لحظہ بہ لحظہ اس کے قریب آرہا تھا۔

''دھرتی کو یہ بات سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ میں ڈوب گیا تو اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ وہ سمندر کو روکتی کیوں نہیں۔ منہ اٹھائے چلا آرہا ہے میری طرف۔''

لیکن سورج کے ایسا سوچنے سے کیا ہوتا ہے؟

سمندر تو واقعی دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس لئے اسے خود کو اور دنیا کو بچانے کی فکر ہونے لگی۔

''کیا میں وقت کو آگے بڑھنے سے روک دوں؟ لیکن یہ تو قدرت کے اصول کے خلاف ہوگا۔''

''تو پھر میں اپنی آنچ کو بڑھا کر سارے سمندر کو سکھا دیتا ہوں۔'' سورج نے سوچا۔

''لیکن اس سے کیا ہوگا۔ دھرتی پر پانی ختم ہو گیا تو بھی زندگی ختم ہو جائے گی۔ زندگی کے لئے پانی بھی اتنا ہی ضروری ہے، جتنی مجھ سے ملنے والی گرمی اور روشنی۔ ایسے میں، میں اپنے آپ کو بچا کر کیا کروں گا؟ میرے جینے کا مقصد تو زندگی کو زندگی دینا ہے، اور اگر زندگی ہی نہیں بچتی تو میرے ہونے یا نہ ہونے کے کوئی معنی نہیں رہ جاتے۔''

سورج فکرمند ہو کر سوچ میں ڈوب گیا۔

کہتے ہیں مصیبت میں جب کوئی راہ دکھائی نہیں دیتی تو آدمی کو خدا کی یاد آتی ہے۔ایسے میں سورج کو بھی اپنے پیدا کرنے والے خالق کی یاد آئی۔

سورج کی تو لاکھوں آنکھیں ہیں۔اس نے وہ سب کی سب اپنے خالق کی نگرانی کی طرف مرکوز کر دیں۔ اپنے خالق کی تلاش کرتے کرتے اس کی نظریں وہاں ٹک گئیں جہاں ملک الموت دربار لگائے بیٹھے تھے۔اس دنیا سے ابھی ابھی وہاں پہنچا ایک آدمی ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔ملک الموت اس کا اعمال نامہ الٹ پلٹ کر دیکھ رہے تھے۔ جیسے جیسے اس آدمی کی کرتوتیں ان پر ظاہر ہو رہی تھیں ویسے ویسے ان کے چہرے پر ناراضگی کے اثرات بڑھ رہے تھے۔ وہ آدمی سمجھ گیا کہ ملک الموت اس کے کالے کارناموں کے لئے سزا کے طور پر دوزخ میں ڈال دے گا۔ دوزخ کے تصور سے ہی اس کی روح کانپ گئی۔

تبھی اسے ایک ترکیب سوجھی، اور اس نے موقع تاڑ کر فوراً اس پر عمل بھی کرلیا۔

اعمال نامہ پوری طرح دیکھ کر ملک الموت نے حکم نامہ لکھنے کے لیے قلم دان کی طرف ہاتھ بڑھایا۔لیکن قلم وہاں ہوتو ملے۔

ملک الموت کو جب اپنا قلم کہیں نہ ملا تو اس آدمی نے معذرت کرتے ہوئے ان کا قلم ان کی طرف بڑھایا اور کہا:

''حضور! میں چور ہوں، چوری کرنا میرا دھرم ہے۔ یہاں بھی میں اپنے آپ کو روک نہیں پایا اور آپ کے قلم پر چپکے سے ہاتھ صاف کر دیا۔''

اپنا قلم واپس مل جانے پر ملک الموت کچھ سوچنے لگے۔

ملک الموت کے دربار میں بیٹھے سب لوگ سوچ رہے تھے کہ اب تو اس چور کی خیر نہیں۔ ملک الموت اس کی کرتوت کے لئے سخت سے سخت سزا دیں گے۔

لیکن ملک الموت کا فیصلہ سن کر سب حیران رہ گئے۔

انہوں نے کہا ''یہ ہے تو چور۔لیکن اپنے دھرم کا پکا ہے۔ مرنے کے بعد بھی اس نے اپنا کام نہیں چھوڑا۔ اس کے اس وصف کی وجہ سے میں اسے معاف کرتا ہوں۔''

اور انہوں نے لکھا ''اپنے دھرم کے پکے اس چور کو جنت میں بھیج دیا جائے۔''

سورج ملک الموت کے دربار کی یہ کاروائی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔اس نے سوچا مجھے میرے مسئلے کا حل مل گیا۔

''چوری جیسا برا کام کرنے والا چور اگر مرنے کے بعد بھی اپنا کام جاری رکھتا ہے تو مجھے بھی باز رہنا چاہئے۔ کہ جلنا میرا دھرم ہے اور زندگی کو روشنی دینا میرا کرم۔''

ایسا سوچ کر اسے افسوس ہوا کہ سمندر میں ڈوب کر مرنے کے ڈر کی وجہ سے اس نے اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے کی بات سوچی تھی۔

''میں بھی اپنی جگہ اٹل رہ کر، اپنی آخری سانس تک جلتا رہوں گا۔ دنیا کو روشنی دیتا رہوں گا۔''

سورج نے ایسا سوچتے سوچتے سمندر کی طرف دیکھا۔

سمندر ہاتھ جوڑ کر سورج کے سامنے کھڑا تھا۔

''حضور! میں تو آپ کو ڈبونے کی بات خواب میں بھی نہیں سوچ سکتا۔لیکن میں تو پرماتما کے حکم کے مطابق آگے بڑھ رہا تھا وہ آپ کا امتحان لے رہے تھے۔''

یہ کہتے ہوئے سمندر پیچھے ہٹتا چلا گیا۔

سورج اپنے آپ سے خوش، پوری آب و تاب کے ساتھ آج بھی آسمان میں چمک رہا ہے۔

♦ رتن سنگھ، اے402، BETA I گریٹر نوئیڈا۔201308

فرزانہ اسد

سورج پر پہرہ

منگل پور میں راجہ گوپی چند کی حکومت تھی۔ وہ بڑا مغرور اور ضدی قسم کا راجہ تھا۔ بات بے بات آس پاس کے حکمرانوں سے اکثر اس کی جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ اسے لڑنے کے لئے معمولی سا بہانہ کافی تھا۔ منگل پور سے ریاست رام پور کی سرحدیں ملی ہوئی تھیں جہاں راجہ چندیل کا راج تھا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ گوپی چند اور راجہ چندیل میں کبھی جنگ کی نوبت نہ آئی ہو۔ گوپی چند کی حکومت میں ایک بہت بڑا دریا بہتا تھا جو دوسری ریاست سے بھی گزرتا اور ہزاروں میل زمین کو سیراب کرتا۔ نہ جانے کتنی کھیتیاں اس دریا کے پانی سے لہلہاتی تھیں۔

ایک مرتبہ گوپی چند کی فوجوں نے راجہ چندیل کی سرحدوں میں گھس کر خوب تباہی مچانے کی کوشش کی لیکن راجہ چندیل جو اس خطرے کو پہلے ہی بھانپ چکا تھا اور اپنی فوجوں کو اس لڑائی کے لیے ہتھیاروں سے لیس کر چکا تھا پوری قوت کے ساتھ آگے بڑھا اور نتیجہ یہ ہوا کہ گوپی چند کو منہ کی کھانی پڑی۔ اس شرمناک شکست سے گوپی چند بوکھلا اٹھا اور کئی دن تک اپنے دشمن کو نقصان پہنچانے کے منصوبے بناتا رہا۔

ایک دن اس نے اچانک وزیر اعظم کو طلب کیا اور حکم دیا کہ ’’وہ ندی جو اس کے ملک سے بہتی ہوئی رام پور میں داخل ہوتی ہے اسے اپنے ملک کی سرحد کے اندر روک دیا جائے۔ ہم اپنے دشمن کی زمین کو کیوں سیراب کریں۔‘‘ وزیر اعظم بادشاہ کی بات کاٹنے کی ہمت نہ کر سکا کیونکہ وہ جانتا تھا ضدی بادشاہ جو بات ایک بار

ٹھان لیتا ہے اسے کر کے ہی دم لیتا ہے۔ درباریوں میں سے بھی کسی نے بادشاہ کو اس بے وقوفی سے روکنے کی جرأت نہیں کی۔ منگل پور کی سرحد پر ندی کے راستے میں ایک بڑا بند ھ باندھ دیا گیا۔

بارش کا موسم شروع ہوا تو ندی کا پانی اپنی سطح سے اونچا اٹھنے لگا کیونکہ اسے آگے روک دیا گیا تھا۔ اس سے منگل پور میں سیلاب کا خطرہ بڑھ گیا۔ ندی پورے ملک میں تباہی مچانے لگی۔ چند عقلمند وزیروں نے بادشاہ کو اس کی حماقت سے ہونے والی پریشانیوں سے آگاہ کرنے کی کوشش کی مگر بادشاہ کا فیصلہ پتھر کی لکیر تھا۔

گوپی چند روزانہ صبح سویرے پرندوں کی چہچہاہٹ اور محل میں سنائی دینے والی سنگیت کاروں کی دلکش موسیقی کی آواز سن کر اٹھ جایا کرتا تھا۔ ایک دن وزیراعظم کو ایک ترکیب سوجھی۔ اس نے چپکے سے تمام سازندوں کو بلا کر یہ حکم دیا کہ وہ اس دن سورج نکلنے سے دو گھنٹے پہلے ہی سنگیت بجانا شروع کر دیں۔ رات گئے بادشاہ سنگیت کی آواز سن کر اپنے نرم بستر پر جاگ اٹھا اور دیر تک سورج کے نکلنے کا انتظار کرتا رہا مگر اجالا نہ ہوا تو جھنجھلا کر وزیراعظم کو طلب کیا اور پوچھا ''یہ کیا ماجرا ہے؟''

وزیراعظم نے جواب دیا ''حضور! آج سورج نکلا ہی نہیں اور نہ اس کے نکلنے کی کوئی امید ہے۔''

''آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'' بادشاہ نے تیوریاں چڑھا کر پوچھا۔

''حضور! سورج مشرق سے نکلتا ہے۔'' وزیراعظم نے بادشاہ کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''مشرق میں ریاست رامپور ہے۔ ہم نے دریا کو ان کے ملک میں جانے سے روک دیا ہے، اسی لئے وہاں کے راجہ چندیل نے بھی سورج کو ہمارے ملک میں نکلنے سے منع کر دیا ہے۔ ہم نے انھیں پانی دینے سے انکار کر دیا ہے تو انھوں نے بھی ہمیں روشنی سے محروم کرنے کے لئے یہ چال چلی ہے۔''

''افوہ! ان کی یہ ہمت'' بادشاہ دیر تک اندر ہی اندر پیچ و تاب کھاتا رہا۔

وزیراعظم بڑی ہوشیاری سے رام پور کے راجہ چندیل کی اس بری حرکت پر اسے برا بھلا کہتا رہا اس سے گوپی چند کا غصہ کسی قدر کم ہوا اور پھر وزیراعظم نے دھیرے دھیرے باتوں باتوں میں اسے یہ سمجھایا کہ سورج راجہ چندیل کی ریاست سے طلوع ہوتا ہے اس لئے ہم مجبور ہیں اور بھلائی اسی میں ہے کہ ندی پر لگی روک ہٹا دی جائے ورنہ بغیر سورج کے تو ہم اندھیرے میں گھٹ کر رہ جائیں گے۔''

بادشاہ دیر تک سورج کے نکلنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر اس نے جھنجھلا کر وزیراعظم سے سورج نہ نکلنے کا سبب پوچھا

گوپی چند کی سمجھ میں آ گیا کہ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس نے حکم دیا ''فوراً گھوڑ سوار کو دوڑاؤ اور راجہ سے کہو ہم آج ہی ندی پر قائم کی گئی رکاوٹ ہٹا رہے ہیں۔ وہ سورج کو نکلنے کی اجازت دے۔''

گھوڑ سوار تیار کھڑا تھا اس نے ایڑ لگائی اور ایک گھنٹے بعد سورج نکل آیا۔□

♦ فرزانہ اسد، 30 گلستان کالونی، جعفر نگر، ناگپور۔440013

دو نظمیں

□ رئیس الدین رئیس

سورج

سورج بولا سب ہے مجھ سے
صبح، شام اور شب ہے مجھ سے
نور کو اپنے کروں میں ارزاں
چاند ستارے کروں درخشاں
آنگن آنگن دھوپ میں ہوں میں
چاندنی کے بھی روپ میں ہوں میں
صبح کو میں مشرق سے جھانکوں
شام کو مغرب میں سوجاؤں
روشنی اپنی کبھی نہ بیچوں
دنیا بھر کو مفت میں بانٹوں

محنت پر سب کو اکسائے
روشنی میری دھن کموائے
میرے بدن میں جو ہے گرمی
اسی سے ہے پھولوں میں نرمی
صوفی ہوں اور سالک ہوں میں
سات رنگ کا مالک ہوں میں
آسمان پر خوب سجے ہیں
دھنک میں میرے رنگ بسے ہیں
جگ مجھ سے ہی پائندہ ہے
دنیا مجھ سے ہی زندہ ہے

◆ رئیس الدین رئیس 10/1725، دہلی گیٹ، علی گڑھ۔202001

محسن باعشن حسرت

سورج

سورج نے ہی تو بخشا کل اور آج ہم کو
سورج نے ہی دیا ہے غلہ اناج ہم کو
سورج اگر نہ ہوتا اُٹھتیں نہیں گھٹائیں
سورج اگر نہ ہوتا چلتی نہیں ہوائیں
پابند وقت کا ہے سورج سے کون بڑھ کر
ہر روز آتا جاتا ہے ٹھیک ہی سمئے پر
رکھتا ہے بھید بھاؤ سورج کہاں کسی سے
پہنچائے فیض سب کو یہ اپنی روشنی سے
سورج نے سارے جگ کو جیسے کیا ہے روشن
مہکاؤ تم بھی یوں ہی تعلیم کا یہ گلشن
سورج کے جیسا اک دن بن جاؤ تم بھی بچو!
کرکے کوئی کرشمہ دکھلاؤ تم بھی بچو!

سورج اگر نہ ہوتا تو روشنی نہ ہوتی
ہم اور تم نہ ہوتے یہ زندگی نہ ہوتی
سورج کے دم سے پھیلا ہر سمت یہ اجالا
آکاش سے زمین تک سورج کا بول بالا
اک آگ کا سمندر سورج میں بہہ رہا ہے
ہم تم نہیں یہ کہتے سائنس نے کہا ہے
اسکول میں پڑھا کر کہنے لگے یہ 'سرجی'
انسان کے بدن میں سورج سے ہے انرجی
سردی میں سب کو گرمی پہنچائے کون؟ سورج!
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لے آئے کون؟ سورج!
سورج کے دم سے بادل سورج کے دم سے پانی
سورج کے دم سے قائم ہم سب کی زندگانی

♦ محسن باعشن حسرت، پرنسپ اسٹریٹ، پہلی منزل کلکتہ-700072

کہانی

◻ راحت روش

نیا قصہ چار درویش

میں تیس سال بعد امریکہ سے لوٹا تو اپنے گاؤں جانے کا بھی دل میں بہت ارمان تھا۔ اپنے پرانے دوستوں سے ملنے اُن سے حال چال معلوم کرنے اور اُن جگہوں کو دیکھنے کے لیے میں بے تاب تھا جہاں میں نے اپنے بچپن کے سنہرے دن گزارے تھے۔ پیڑوں پر چڑھ کر کھیلنا۔ کھیتوں سے گنے توڑ توڑ کر کھانا۔ اسکول سے اکثر ناغہ کرکے پاس بہتی ندی میں نہانا، مجھے پل پل یاد تھا۔ اس یاد کو تازہ کرنے کے لیے میں گاؤں پہنچا۔

اپنا آبائی گھر دیکھا جو اب ایک عالیشان مکان میں بدل چکا تھا۔ اُس کے موجودہ مالک کبھی ہمارے کرایہ دار ہوا کرتے تھے۔ گاؤں کی سڑک بھی پکّی بن گئی تھی۔ گھروں میں بجلی آگئی تھی۔ پرانے رہٹ کی جگہ ٹیوب ویل نے لے لی تھی۔ گاؤں کا پرائمری اسکول انٹر کالج بن چکا تھا۔ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اپنے دوست یاد آئے، اُن کے بارے میں معلومات کیں۔ ایک سب سے قریبی دوست رفیق کے مکان کی طرف گیا جو کسی زمانے میں ادھ کچا ادھ پکا تھا۔ وہاں پہنچا تو مکان پہچاننے میں مجھے زیادہ دقت نہ ہوئی۔ اس کی حالت تقریباً ایسی ہی تھی سوائے ایک کمرے کے جو کچھ نیا سا تھا باقی اور بھی کمزور ہو گیا تھا۔

باہر ایک بورڈ لٹکا تھا جس پر بڑا بڑا لکھا تھا— 'انجمن خدمتِ خلق'۔ میں اندر داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہوں— چار لوگ درویشوں کی شکل میں 'مسکین صورت' بیٹھے ہیں۔ غربت اُن کے حلیے سے ظاہر تھی۔ مگر چہرے چمک رہے تھے۔ اُن میں سے دو کی داڑھی مختصر اور باقی دو کی بہت بڑھی ہوئی تھی۔ میں نے قریب پہنچ کر سلام کیا۔ اُن میں سے ایک اُٹھا اور ''ارے سعید تم؟'' کہتا ہوا مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ میں بھی اُس کو پہچان گیا، وہ میرا سب سے گہرا دوست رفیق تھا۔ میں نے کہا: ''ارے رفیق تم نے یہ حالت کیسی بنا رکھی ہے؟'' وہ بولا: ''پہلے آرام سے بیٹھو، اِن سے ملو۔ یہ فضلو ہے، فضل الدین، جو تمہارے گھر کے بالکل برابر میں رہتا تھا۔ اور یہ انجم ہیں جو ہمارے ساتھ پرائمری اسکول میں پڑھتے تھے۔'' میں نے اُن دونوں کو بھی پہچان لیا۔ رفیق گہری سانس لیتے ہوئے بولا: ''اور یہ چوتھی کرسی پر ہمارے ساتھ پڑھنے والے عبدالخالق ہیں جو اَب سے دس سال پہلے امریکہ سے ہی لوٹے ہیں۔''

میں وہاں کے ماحول سے کچھ مانوس سا ہوا تو میں نے استفسار کیا: ''بھئی تم یہاں کیوں اکٹھا ہو، اور باہر یہ 'انجمن خدمتِ خلق' کا بورڈ کیسا ہے؟''

میرا دوست رفیق گویا ہوا: ''یہ بڑی لمبی کہانی ہے۔ ہم چاروں دوست کسی نہ کسی مصیبت کے شکار رہے ہیں۔ اب الحمدللہ یہاں آکر

جمع ہو گئے ہیں اور عوام کی بہبودگی کے لیے یہ انجمن بنائی ہے۔'' میں نے بیچ میں ٹوکتے ہوئے کہا: ''مگر پہلے یہ بتائیے کہ آپ لوگ اب تک کیا کر رہے تھے۔ اپنی کہانیاں سنائیے۔'' رفیق بولا: ''یہ بڑی تلخ کہانیاں ہیں، تم سن کر کیا کرو گے؟''

''نہیں تمہیں سنانی ہوں گی۔'' میری بے چینی محسوس کرتے ہوئے رفیق بولا۔

''تو سنو! تمہیں تو معلوم ہی ہے میں کلاس میں کتنا شرارتی تھا،

اکثر ایسی شرارتیں کرتا تھا کہ اسکول کے کسی نہ کسی ساتھی کا نقصان ہو جاتا۔ بعد میں مجھے سزا بھی خوب ملتی تھی لیکن میں پھر وہی کرتا۔ یاد ہے ایک دن میں نے کلاس کا بورڈ توڑ دیا تھا، جس کے سبب ہماری کلاس کو کئی سال تک بورڈ نصیب نہیں ہوا، اور بچے بغیر بورڈ کے ہی پڑھتے رہے۔ ایک دن میں نے کلاس کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے، جس سے سردیوں کے موسم میں ٹھنڈی ہوا آتی، گرمیوں میں لوؤں کے تھپیڑے سہنے پڑتے اور برسات میں بارش کا پانی اندر آنے لگتا اور اکثر پڑھائی رک جاتی۔ سردی و گرمی سے مناسب بچاؤ کا انتظام نہ ہونے کے سبب کچھ بچے بیمار بھی ہو گئے تھے۔ میں نے اپنے جیسے کچھ ساتھیوں کو ملا کر ایک ٹولی بنالی تھی۔ ہم سب طاقتور تھے۔ اس لیے کوئی ہم سے ٹکر لینے کو تیار نہ ہوتا تھا۔ غرض ہم اپنی نت نئی شرارتوں سے ہیڈ ماسٹر صاحب تک کا ناک میں دم کیے رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک نئے ہیڈ ماسٹر صاحب کا ہمارے اسکول میں تقرر ہوا۔ مجھے حسب عادت شرارت سوجھی۔ پہلے دن جب وہ اسکول کی اسمبلی میں آئے میں کسی

کام کا بہانہ کر کے ٹھیک اُن کی کرسی کے پیچھے پہنچ گیا۔ جیسے ہی وہ بیٹھنے والے تھے، میں نے پیچھے سے کرسی کھینچ لی اور وہ گر گئے۔ سب بچوں کا ہنستے ہنستے برا حال ہو گیا۔ لیکن ہیڈ ماسٹر صاحب باوقار انداز سے پھر کھڑے ہوئے ایک لمبی تقریر کی جس میں اُنھوں نے بہت سی نصیحتیں کیں۔ اُن کی تقریر کا ایک جملہ اب تک میرے کانوں میں گونج رہا ہے، ''باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔'' یہ جملہ مجھ پر پورا صادق آیا۔ میں نے پانچویں کلاس پاس کرنے میں تین سال خرچ کیے۔ میں نے اور آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ گھر والوں نے مجھے لاکھ سمجھایا پر میری سمجھ میں نہ آیا۔ تھک ہار کر گھر والوں نے مجھے پاس کے قصبے میں ایک کارخانے میں مجھے کام سکھانے میں بٹھا دیا۔ یہاں بھی میں اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا۔ آخر کار کارخانہ دار نے مجھے برخاست کر دیا۔ ایک دوسری جگہ کام کرنے لگا۔ اُس فیکٹری کا مالک محنتی ہونے کے ساتھ ساتھ سخت بھی تھا، اُس کی سختی سے میں کچھ کام تو سیکھ گیا لیکن میرا وہاں بھی دل نہ لگا۔ وہاں سے چھوڑ کر قریب کے شہر میں ایک بنیے کی دُکان پر ملازمت کر لی۔ جہاں صبح سے شام تک محنت کرنے کے بعد بمشکل اتنا حاصل کر پاتا کہ دو وقت کی روٹی میسر ہوتی۔ تنخواہ کبھی ملتی کبھی نہ ملتی، غرض دن گزرتے گئے۔ کچھ سال بعد میرے یہ دوست عبدالخالق امریکہ سے آئے اور اُنھوں نے مجھے گاؤں بلایا اور اس انجمن میں شامل کر لیا۔'' میں اس کی حالت پر افسوس کرنے لگا لیکن اُس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر خاموش رہا۔

اب دوسرے دوست نے اپنا منہ کھولا:

''میں نے گاؤں کے اسکول میں کسی نہ کسی طرح پڑھ کر شہر کے اسکول میں داخلہ لے لیا۔ وہاں ہائی اسکول کئی سال میں بھی پاس نہ کر سکا۔ آخر ایک کارخانہ میں ملازم ہو گیا، وہاں اپنی دھاک کی وجہ سے یونین کا لیڈر بن گیا۔ کئی مرتبہ کارخانہ میں ہڑتال کرائی۔ مالک کا جب زیادہ نقصان ہوا تو اُس نے کارخانہ بند کر دیا۔ میرے ساتھ کارخانہ کے کے سارے ملازمین بے روزگار ہو گئے۔ اب جیسا کہ تمھیں رفیق نے بتایا، عبدالخالق کے امریکہ سے آنے پر میں بھی یہاں گاؤں میں آ گیا۔'' اب تیسرے شخص (فضل الدین) کی باری تھی، اُس نے اپنی کہانی سنانا شروع کی— ''میری تعلیم میرے والد کے انتقال کے بعد ادھوری رہ گئی تھی۔ حالانکہ میری والدہ جو مجھ سے بہت محبت کرتی تھیں نے مجھے تعلیم کے لیے شہر بھیجنا چاہا لیکن میں پڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ میرے دل میں تو بس ایک بڑا نیتا بننے کا بھوت تھا۔ میں جب کبھی شہر سے کسی نیتا کے آنے کے بارے میں سنتا تھا تو اُس کے آنے کا منتظر رہتا اور تمام وقت اس کے ساتھ رہتا، اس کی نقل

کرتا۔ گھر آ کر شیشے کے سامنے اُسی کی طرح تقریریں کرتا۔ غرض جب تک کچھ بڑا ہوا تو مجھے اچھی خاصی تقریر کرنی آ گئی۔ اب الیکشن کے وقت نیتا لوگ مجھے اپنے جلسوں میں بلانے لگے، جہاں میں تقریریں کرتا اور میری تقریریں پسند کی جانے لگیں، اب مجھے مالی فائدہ بھی حاصل ہونے لگا اور جس سے میں اپنے گھر کا خرچ اٹھانے لگا۔ جوان ہوا تو ایک مقامی پارٹی کے جوان وِنگ کا سیکریٹری بنا دیا گیا۔ حکومتِ وقت کی پالیسیوں کے خلاف ہڑتالیں کرانا ہمارا آئے دن کا معمول تھا۔ کبھی کسی بات پر کسی بہانے شہر میں ہڑتال کرادی جاتی۔ جوں جوں الیکشن قریب ہوتا ہماری اس طرح کی سرگرمیاں بڑھتی جاتیں۔

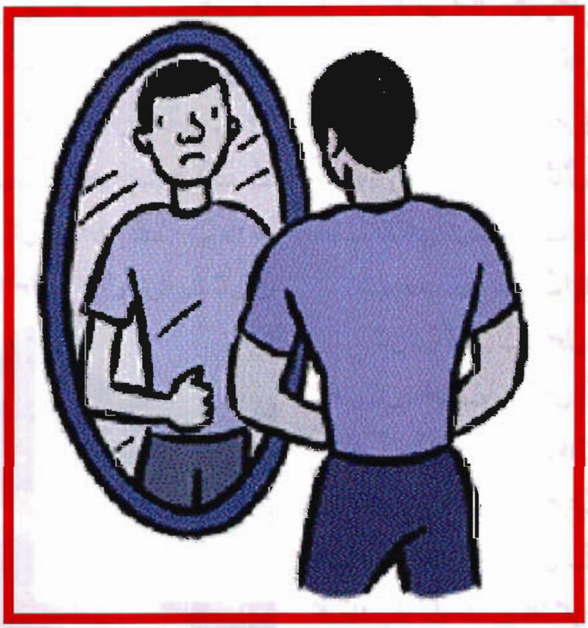

ایسے ہی ایک مرتبہ الیکشن کا زمانہ قریب تھا، میں الیکشن کی تیاری کے ساتھ ساتھ ہڑتالیں کرانے میں بھی مصروف تھا۔ ایک دن گاؤں سے خبر آئی کہ والدہ کی طبیعت خراب ہے میں اتنا مصروف تھا کہ گاؤں جانے کا وقت نہیں نکال پارہا تھا۔ اسی درمیان پھر خبر آئی کہ والدہ کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ مجھے بلارہی ہیں۔ میں اپنی والدہ سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ انھوں نے باپ کے انتقال کے بعد ماں اور باپ دونوں کے فرائض میرے لیے پورے کیے تھے چنانچہ ماں کی محبت سے مجبور ہو کر میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر پہنچا تو دیکھا ماں نیم غشی کی حالت میں تھیں۔ میرے آواز دینے پر اُنھوں نے آنکھ کھول کر دیکھا، مجھے خوب پیار کیا۔ میں نے لوگوں سے حالات معلوم کیے۔ مجھے بتایا کہ آج شہر سے ڈاکٹر صاحب آئے تھے۔ اُنھوں نے یہ دوا لکھ کر دی ہے اور کہا ہے کہ فوراً شہر سے منگالو۔ یہاں آج کوئی بس یا اور کوئی سواری نہیں ہے کیونکہ ہڑتال ہے۔ میں نے اپنا اسکوٹر لیا اور شہر پہنچ گیا۔ وہاں جا کر دیکھا تو سب بازار بند ہیں۔ کیونکہ ہماری پارٹی کی طرف سے آج ہڑتال کا اعلان کیا گیا تھا۔ میں ایک بازار سے دوسرے بازار، دوسرے سے تیسرے بازار گیا لیکن ہڑتال اس قدر کامیاب تھی کہ چھوٹی سے چھوٹی دُکان بھی نہیں کھل رہی تھی۔ اور کوئی دن ہوتا تو میں اِس کامیابی پر انتہائی خوش ہوتا لیکن آج میرے سامنے دوسرا مسئلہ تھا۔ مجھے اپنی والدہ جو زندگی اور موت سے لڑ رہی تھیں، کے لیے دوا کی فوری ضرورت تھی۔ کسی دکان کے نہ کھلے ہونے پر مجھے انتہائی غصہ آیا تھا، آخر ایک جانکار ڈاکٹر کے پاس پہنچا۔ اُن کو حالات بتائے۔ اُنھوں نے کہا شاید یہ دوا میرے گھر پر موجود ہے، میں دیدیتا ہوں۔ کچھ دیر بعد انھوں نے وہ دوا مجھے لاکر دی۔ وقت پر ان کی مدد سے میں بے حد متاثر ہوا وہ مجھے فرشتہ سے کم نہیں لگے تھے۔ الغرض میں میں دوا لے کر واپس آیا تو دیکھا میری ماں کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرچکی تھی۔ گویا مجھ پر غموں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا اور مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا کہ جس ماں نے مجھے اپنا سب کچھ نچھاور کر کے پالا پوسا گویا کہ وہ میرے ہی اعمال کی نذر ہوگئیں۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں 'خود آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا' کے مصداق سزاوار ہوں۔ چنانچہ اُسی روز سے میں نے سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ اور اب اِن کے ساتھ مل کر یہ انجمن چلا رہا ہوں۔''

اب عبدالخالق کی باری تھی جس سے میں زیادہ واقف نہیں تھا۔ وہ اُن سب میں زیادہ بااثر لگ رہا تھا۔ اُس نے سنانا شروع کیا:

''میری کہانی بھی اتنی درد بھری ہے اور اتنی ہی پریشان کن ہے،

میں زندگی کے جس موڑ سے ایک مرتبہ گزرا اُس نے میری زندگی کی دھارا ہی بدل دی۔ تمھیں تو معلوم ہی ہے پانچویں کلاس گاؤں کے اسکول سے پاس کرنے کے بعد مجھے شہر بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں انٹر کالج میں داخلہ ہوگیا، جہاں امتیازی نمبروں سے انٹر پاس کیا پھر قریب کے شہر میں ایک یونیورسٹی میں انجینئرنگ میں داخلہ مل گیا۔ تعلیم کے دوران میری شادی کر دی گئی، حتیٰ کہ ایک بچہ بھی ہوگیا۔ مزید برآں انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد امریکہ سے آفر آگئی اور میں وہاں چلا گیا۔ وہاں کے ماحول اور وہاں کی زندگی سے اتنا متاثر ہوا کہ اُس میں کھوگیا اور اپنا آبائی گھر و خاندان ہی بھول گیا۔ البتہ ہر ماہ پابندی سے کچھ رقم بھیجتا رہا۔ کچھ عرصہ بعد وہاں میں نے ایک مقامی لڑکی سے شادی کر لی جس سے میرا ایک لڑکا ہوا۔ زیادہ عرصہ اس لڑکی سے رفاقت قائم نہ رہ سکی اور بچے کو لے کر اور مجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ یہ حادثہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھا۔ میں امریکہ جیسی پُر بہار دنیا میں خود کو تنہا محسوس کرنے لگا، گھر کی یاد آئی تو فون کر کے حالات معلوم کیے۔ دوسری جانب سے ہمارے پرانے ملازم نے ریسیور اُٹھایا، آواز میں ارتعاش بڑھاپے کی غمازی کر رہا تھا تاہم میں نے آواز پہچان لی۔ ''ارے راشد! یہ تم بول رہے ہو.... سب خیریت ہے نا؟''

''ہاں بابو جی سب خیریت ہے۔'' اُس نے جواب دیا۔ ''بس آپ کا کتا مر گیا ہے... باقی سب خیریت ہے۔''

''ارے میرے کتے کو کیا ہوا تھا؟''

''بابو جی مرے ہوئے گھوڑے کا گوشت کھا کر بے چارا کتا مرتا نہیں تو اور کیا ہوتا... باقی سب خیریت ہے۔''

''ہائیں، میرے گھوڑے کو کیا ہوا؟''

''بابو جی اُسے خوراک دینے والا کوئی نہیں تھا.... بے چارہ مرتا نہیں تو اور کیا ہوتا؟ باقی سب خیریت ہے۔''

''کیوں تمہاری بی بی جی کو کیا ہوا... انھوں نے اُسے چارہ پانی کیوں نہیں دیا؟''

''بابو جی وہ چھوٹے مالک (میرا بیٹا) کے غم برداشت نہ کر پائیں اور اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ باقی سب خیریت ہے۔''

''اف!! میرے بیٹے کو کیا ہوا؟''

''بابو جی اُس پر مکان کی چھت گر گئی تھی... باقی سب خیریت ہے۔''

''اوہ! ...اوہ!! ...غضب خدا کا میرا مکان گر گیا، میرا بچہ، بیوی... کتا اور گھوڑا بھی ختم ہوگئے... اور تو کہتا ہے سب خیریت ہے... اب بچا ہی کیا ہے خیریت کے لیے؟؟''

''ہاں بڑے مالک باقی سب خیریت ہے۔''

مجھے غم وغصہ کی شدت سے چکر آ گیا۔ کانپتے ہاتھوں سے میں نے ریسیور رکھ دیا اور اگلی ہی فلائٹ سے اپنے وطن واپس آ گیا۔ یہاں آ کر اپنے ان ساتھیوں کو اکٹھا کیا اور ان کے سامنے اپنی تجویز رکھی کہ ہمیں لوگوں کی خدمت کرنا چاہیے۔ یہ لوگ بھی اپنے اپنے حالات کا شکار تھے فوراً ہی میری تجویز سے اتفاق کر لیا۔ رفیق جو اسکول میں شیشے توڑتے تھے، انھوں نے تعلیم کا شعبہ سنبھال لیا ہے۔ فضل الدین، جن کی والدہ دوا نہ ملنے کی وجہ سے انتقال کر گئیں تھیں، اب ایک خیراتی دواخانہ چلا رہے ہیں۔ میں خود اس انجمن کا صدر ہوں۔''

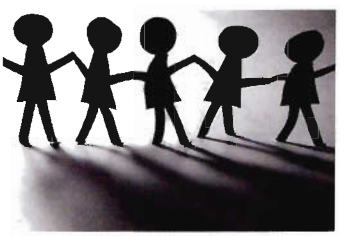

ان چاروں کے جذبات سے متاثر ہو کر میں بھی اُن کی انجمن میں شامل ہو گیا اور یوں اس قصہ کا پانچواں درویش بن گیا۔ □

♦ راحت روش 1235 گلی محل سرائے، حویلی حسام الدین حیدر، بلیماران، دہلی-6

اطہر رضا بلگرامی

چالاک چوہے

چوہے کہا جاتا ہے کہ انتہائی سیانے ہوتے ہیں۔ وہ کتنے سیانے ہوتے ہیں۔ اس کا آنکھوں دیکھا حال پیش کر رہا ہوں۔

کسی زمانہ میں سرخ رنگ کا کولگیٹ ہیر آئیل بہت مشہور تھا۔ بیشتر گھروں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کی خوبصورت شیشی سے تیل پتلی دھار کی شکل میں نکلتا تھا کیونکہ چھید بہت باریک ہوتا تھا اور کھلے منہ کی شیشی نہیں ہوتی تھی۔ کمرے کے کونے میں بچھی میز پر یہ شیشی کھلی رکھی تھی۔ ایک تندرست چوہے کو شاید اس کی خوشبو پسند آ گئی۔ میں دیکھ رہا تھا، وہ میز پر چڑھا، شیشی کے چاروں طرف طواف کیا، شیشی کو چاہتا گرا دیتا لیکن گرایا نہیں بلکہ باقاعدہ سونگھ کر اور کچھ چڑھ کر معائنہ کیا، پنجے کے سہارے کھڑا ہوا اور گردن کو گھما گھما کر معائنہ کرتا رہا۔ پھر شیشی کے گردنے کی چوڑی جگہ پر ادھر ادھر اپنے دونوں پنجے رکھے اور کچھ طاقت لگا کر آزمایا، پھر ایک مضبوط جست لگا کر اپنی دونوں ٹانگوں کو شیشی کے پیٹ میں حائل کر کے توازن سنبھالتے ہوئے دھیرے، دھیرے اوپر کی طرف ٹانگوں کی مدد سے چڑھنا شروع کیا بالکل اسی طرح جس طرح کوئی پیڑ پر چڑھتا ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے چوہا شیشی کے گردنے پر بیٹھا نظر آیا جس کی دم نیچے لٹکی ہوئی تھی۔ اس نے اپنی دم کا چھلا بنانا شروع کیا اور اس کو اوپر سمیٹا۔ پھر شیشی کے گردنے پر پیر رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اور چھلا بنی دم کو اس کے باریک چھید پر رکھ کر دم کے سرے کو ٹٹول کر چھید میں ڈال دیا۔ دم تیل میں ڈوبی جس کو اس نے احتیاط سے کھینچ کر اوپر نکالا اور دم کے سرے کو منہ میں ڈال کر چوس لیا۔ یہ عمل وہ بار بار کرتا رہا اور سلیقے سے تیل پیتا رہا۔ پھر شاید اس کو اپنے ساتھیوں کی یاد

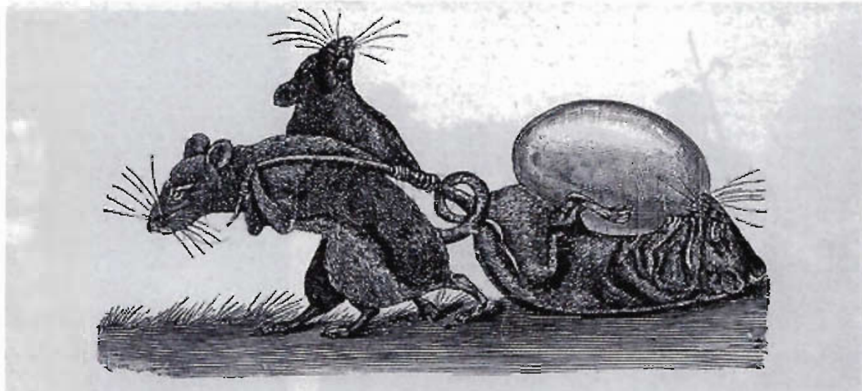

آئی۔ وہ احتیاط سے اترا اور تیزی سے اپنے بل میں گھسا تاکہ ساتھیوں کو اطلاع کی جاسکے۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس غیر حاضری سے فوراً فائدہ اٹھاتے ہوئے تیل کی شیشی ہٹالی گئی۔ لیکن میں چوہے کی سلیقہ شعاری کا قائل ہوگیا۔ نہ شیشی گرائی، نہ تیل برباد کیا اور تہذیب کے دائرے میں اپنی خواہش بھی پوری کر لی۔

دوسرے مشاہدے نے اور حیرت میں ڈال دیا۔ کمرے میں تین درجوں کی الماری تھی۔ جس کی دیواریں کچی تھیں۔ درمیانی درجہ کے کونے میں چوہے نے چھید کر رکھا تھا۔ جس میں وہ نکل کر خانے میں رکھی چیزوں کو کترتا رہتا تھا۔ ایک بار اس میں انڈے رکھ دیئے گئے۔ ایک دوپہر جب سناٹا تھا کیا دیکھتا ہوں کہ بل سے چوہا نکلا، انڈوں کے چاروں طرف گھوما پھر بل سے قریب والے انڈے کو منہ سے ڈھکیلتا ہوا بل کے قریب لے گیا۔ اس کو شاید یہ احساس ہوگیا کہ بل کے مقابلہ انڈے کا سائز بڑا ہے۔ اس لئے انڈا بل میں نہیں لے جایا جاسکتا ہے۔ اس نے انڈے کو منہ سے دوبارہ چھید سے تھوڑا دور کر دیا اور دوڑ کر چھید میں گھس گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے تیزی سے چھید سے مٹی نکلنی شروع ہوگئی۔ شاید چوہا چھید کو بڑا کر رہا تھا۔ اس کے پچھلے پیر تیزی سے مٹی کو باہر پھینک رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر میں اس نے چھید کو اچھا خاصہ بڑا کرلیا۔ چاہتا تو انڈے کو ڈھکیلتا ہوا چھید میں لے جاتا۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ وہ چھید میں گھسا اور اپنے ایک ساتھی کے ساتھ واپس آیا۔ دونوں نے مل کر چھید کے منہ پر ڈھیر مٹی کو پہلے صاف کیا، مٹی کو ادھر ادھر بکھیر کر بل کے منہ کو صاف کیا۔ پھر ساتھی چوہا چت لیٹ گیا اور پہلے والے چوہے نے انڈے کو ڈھکیل کر چت لیٹے چوہے کے بغل میں لاکر لگادیا اور دھیرے دھیرے منہ سے ڈھکیل کر چت لیٹے چوہے پر چڑھا دیا۔ اس نے فوراً اپنے پنجوں سے انڈے کو پکڑ لیا۔ پھر وہ چوہا بھاگ کر گیا اور اس کے دم منہ میں داب کر دھیرے دھیرے گھسٹتا ہوا بل کی طرف لے چلا، پہلے بل کے اندر خود گھسا اور بل کے دہانے کے پاس انڈہ لیے لیٹے چوہے کی دم کو منہ میں داب کر بل کے اندر گھسیٹا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ چوہا انڈہ لیے بل کے اندر غائب ہوگیا۔ شاید یہ احتیاط اس لیے برتی کہ انڈہ نہ ٹوٹنے پائے۔

تو ملاحظہ کیں آپ نے چوہوں کی نفاست اور چالاکیاں۔ □

● سید احمد رضا بلگرامی B-40، جوہری فارم، اوکھلا، نئی دہلی۔110025

مضمون کہانی

□ ایم آئی ساجد

بڑا آدمی

سرحد پر دشمن کی ہلچل کی خبر سننے کے بعد فوجی چھاؤنی سے بہت ساری فوجی گاڑیاں فوجی ساز وسامان کے ساتھ نکل پڑیں۔ تمام معائنہ کرنے کے بعد اور دشمن کو اپنی آمد اور طاقت کا اشارہ دینے کے بعد دشمن کی طرف سے ہونے والی تمام ہلچل ختم ہوگئی۔ دور دور تک سناٹا چھا گیا۔ بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی جب کوئی ہلچل نہ ہوئی تو اطمینان ہوگیا کہ دشمن بھاگ کھڑا ہوا اور اب جلد ہی ادھر کا رخ نہیں کرے گا۔ پوری طرح اطمینان ہوجانے کے بعد فوجی گاڑیاں پھر سے ملٹری چھاؤنی کی طرف روانہ ہوگئیں۔ فوج میں ڈسپلن، وقت اور احتیاط کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ فوج کی تمام گاڑیاں ایک کے پیچھے ایک مناسب رفتار سے چلی جارہی تھیں کہ اچانک سب سے آخر کی گاڑی راستہ اوبڑ کھابڑ ہونے کی وجہ سے اچانک ایک بڑے سے گڈھے میں گر پڑی جو سڑک کے کنارے کسی ضروری کام سے بنایا گیا تھا۔ فوجی گاڑی میں سوار تمام فوجی اپنے اپنے کپڑے جھاڑ کر اوپر آئے۔ ان کا کمانڈر بھی اوپر آ گیا اور سپاہیوں کو جیپ باہر نکالنے کے لئے ہدایات دینے لگا۔ اس طرف سے اوپر اٹھاؤ... بائیں طرف کا توازن قائم رکھو... پہیوں کو اوپر اٹھاؤ... یونٹ کو مضبوطی سے پکڑ کر سیدھا کرو... گاڑی میں رکھے رسّے کی مدد سے اسے باندھ کر اوپر لے آؤ وغیرہ وغیرہ۔

کمانڈر اپنے ماتحت فوجیوں کو گاڑی اوپر لانے کے لیے ادھر سے ادھر گھوم کر ہدایات دے ہی رہا تھا کہ پیچھے سے ایک اور شاندار فوجی کوچ آئی۔ اس میں سے ایک بارعب شخص اترا۔ ساتھ ہی کوچ بان بھی اتر آیا۔ دونوں نے کسی سے کوئی بات نہ کرتے ہوئے گڈھے میں اتر کر فوجیوں کی بھرپور مدد کی اور گاڑی کو اوپر لانے میں کامیاب ہوگئے۔ اوپر پہنچ کر بھی گاڑی کو صاف کیا، اسے درست کیا پھر کمانڈر کے پاس آ کر اس بارعب شخص نے اس سے ہاتھ ملایا اور کہا ”آفیسر! فوجی چھاؤنی پہنچ کر مجھ سے ملاقات کرو۔“ یہ کہہ کر وہ اپنی کوچ میں بیٹھا اور گاڑی روانہ ہوگئی۔ کمانڈر نے کی نظریں جاتی ہوئی کوچ پر گڑی ہوئی تھیں۔ پسینے سے اس کا جسم بھیگ گیا اور ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔ اسی

▲ جارج کے عہد جوانی کی ایک پینٹنگ

حالت میں وہ گاڑی میں بیٹھ کر فوجی چھاؤنی کی طرف روانہ ہوگیا۔

فوجی چھاؤنی پہنچ کر تمام فوجی اپنے اپنے کمروں کی طرف چلے گئے اور اپنے اپنے کام دھندوں میں لگ گئے۔ کمانڈر کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ دل میں عجیب عجیب سے خیالات آ رہے تھے۔ وہ پوری طرح ڈرا اور سہا ہوا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے غسل کیا دوسرے کپڑے پہنے اور اس بارعب فوجی افسر سے ملاقات کے لئے چل پڑا۔ ایک شاندار کیمپ کے پاس پہنچ کر اس نے باہر ڈیوٹی پر حاضر فوجی سے اندر جانے کی اجازت مانگی۔ کچھ دیر بعد اسے اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ اندر پہنچتے ہی کمانڈر نے فوجی انداز میں اس بارعب شخص کو جو ایک آرام دہ کرسی پر اطمینان سے بیٹھا تھا سلیوٹ (سلام) کیا اور ادب سے کھڑا ہوگیا۔ اس بارعب شخص نے کمانڈر کا نیچے سے اوپر تک جائزہ لیا اور پھر پوچھا۔

''تمہیں فوج میں کام کرتے ہوئے کتنا عرصہ ہوگیا؟''

''سر! میں دس برس سے فوج میں کام کر رہا ہوں۔'' کمانڈر نے آہستہ سے کہا۔

''ایک فوجی کا سب سے بڑا کام اور مقصد کیا ہوتا ہے؟'' سوال پوچھا گیا۔

''دشمن کو منہ توڑ جواب دینا، اپنے ملک کی حفاظت کرنا اور جہاں کہیں بھی ضرورت ہو عوام کی پوری پوری مدد کرنا۔'' کمانڈر نے جواب دیا۔

''کیا اس میں تمہارے ماتحت اور ساتھی نہیں آتے؟'' بارعب شخص نے پوچھا۔

''جی سر! بالکل آتے ہیں۔'' کمانڈر نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔

''پھر تم نے گڈھے سے گاڑی نکالنے میں اپنے ماتحتوں کی عملی مدد کیوں نہیں کی؟'' بارعب شخص نے کرسی سے اٹھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''سر! معافی چاہتا ہوں، مجھ سے واقعی غلطی ہوگئی۔ اس کے بعد پھر کبھی ایسا نہیں ہوگا میں وعدہ کرتا ہوں۔'' کمانڈر نے کانپتے ہونٹوں سے کہا اور سر جھکا لیا۔

''سچ کہہ رہے ہو تم؟'' بارعب شخص نے پوچھا۔

''یس سر! میں سچے دل سے وعدہ کرتا ہوں اور قسم کھاتا ہوں۔'' کمانڈر نے کہا۔

''ٹھیک ہے! تمہاری یہ پہلی غلطی معاف کی جاتی ہے۔ اپنے وعدے پر قائم رہو۔ اب تم جا سکتے ہو۔'' بارعب شخص نے کمانڈر کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ کمانڈر لڑکھڑاتے قدموں سے چہرے کا پسینہ صاف کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ بچو! جانتے ہو وہ شخص کون تھا؟

وہ بارعب شخص ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا پہلا صدر جارج واشنگٹن تھا۔ ◻

♦ ڈاکٹر ایم آئی ساجد نزد نگر پریشد اردو اسکول نمبر 5 ضیا کالونی کھام گاؤں۔ 444303

خلیق الزماں نصرت

لالچ کی سزا

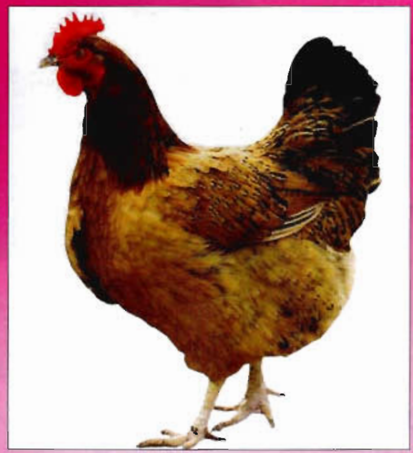

ایک تھا بھیّا چوبے داس
رہتا تھا ہر دم وہ اداس
دن بھر محنت کرتا تھا
بھوکا پھر بھی رہتا تھا
اپنی غربت سے تنگ آکر
مانگی دعا مندر میں جاکر
ہے بھگوان تو مجھ کو اٹھالے
یا غربت سے مکتی دلا دے
ایشور نے تب اس کی سن لی
بھیج دی اس کے گھراک مرغی
سونے کے انڈے دیتی تھی
پھر بھی تھی وہ مرغی جیسی
بازاروں میں بیچ کے انڈے
پورے کرنے لگا وہ خرچے
روپے اکٹھے کرنے لگا وہ
خوب مزے میں رہنے لگا وہ

اک دن اس کی شامت آئی
لالچ میں اک بات یہ سوچی
دیتی ہے جو سنڈے منڈے
پیٹ میں ہوں گے بہت سے انڈے
فوراً مرغی اس نے منگائی
چھری گلے پر اس نے چلائی
پیٹ میں اس کے ہاتھ جو ڈالا
ہاتھ میں اس کے کچھ نہ آیا
لگا وہ رونے سر کو پکڑے
کہو ملا کیا لالچ کرکے

♦ خلیق الزماں نصرت، 1922/6، فلیٹ نمبر 15، بلڈنگ نمبر B-4، سائی نگر کالونی بھیونڈی، مہاراشٹر۔421302

ایمانداری کا انعام
کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ
پرانا قصہ ہے کہ دمشق میں ایک ایماندار سوداگر رہتا تھا۔لوگ اس کے پاس اپنا مال دولت امانت کے طور پر چھوڑ جاتے تھے۔ایک مرتبہ اس سے بھول ہوگئی اوراس نے ایک آدمی کی امانت میں گڑ بڑ کردی۔لوگ اس سے خفا ہو گئے اور لین دین بند کر دیا ۔کچھ ہی دنوں میں وہ فقیر ہو گیا۔
اف !اگر میں ایمانداری پر قائم رہتا تو یہ برے دن دیکھنے نہ پڑتے
کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا اور کافی قرض دار ہو گیا تھا
اس کا ایک بیٹا تھا جو کافی سمجھ دار اور عقل مند تھا۔اس نے والد کا یہ حال دیکھا تو خود الگ رہنے لگا اور جو کچھ کماتا اسی پر صبر شکر کر لیتا
یا خدا، مجھے اپنی کمائی پر صبر ہے مجھے ہر لالچ سے بچا اور ایمان پر قائم رکھ
اس کے پڑوس میں ایک فوجی افسر رہتا تھا۔اسے ایک دن کسی جنگ میں جانے کا حکم ہوا۔جب چلنے لگا تو اس نے سوداگر کے لڑکے کو دس ہزار دینار دیے
میاں دیکھو، میں نے یہ رقم اپنے بچوں کے لیے جمع کی ہے اسے سنبھالو
زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں اگر میں جنگ سے واپس آ گیا تو خود رقم واپس لے لوں گا نہیں آیا تو ضرورت کے وقت میرے بچوں کو دے دینا
جناب عالی ! آپ کوئی فکر نہ کریں اور اطمینان سے جائیں
وہ فوجی جنگ میں مارا گیا اور اس کے دس ہزار دینار لڑکے کے پاس امانت رہے
سوداگر کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بیٹے کے پاس پہنچا
بیٹا یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میرے حالات آج کل کتنے خراب ہیں

...اگر تم اس میں سے تھوڑی رقم مجھے قرض دے دو تو میرا کام چل جائے گا
ابا آپ تو جانتے ہی ہیں کہ اپنا کام آپ نے امانت میں خیانت سے چوپٹ کیا ہے
!
...میری جان بھی چلی جائے تب بھی میں اس رقم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا
اور اس نے والد کو اس دولت میں سے ایک دینار بھی نہیں دیا
وقت گزرتا رہا۔ فوجی کے گھر میں رقم کی ضرورت ہوئی۔ سخت پریشانی کا وقت تھا۔ مگر کسی کو اس رقم کی خبر نہیں تھی۔ اس پریشانی کے عالم میں بچوں نے بادشاہ کو مدد کرنے کی عرضی دی۔ اس کا پتہ سوداگر کے بیٹے کو بھی ہوا۔ وہ فوراً رقم لے کر ان کے پاس پہنچا اور رقم انھیں دے دی
یہ دس ہزار دینار تمھاری امانت میرے پاس ہیں ان سے اپنا کام چلاؤ
یا اللہ یہ انسان ہے یا فرشتہ اتنا ایماندار اللہ اسے اس کا اجر دے
انھوں نے سوداگر کے بیٹے کو اس کی ایمان داری سے خوش ہو کر ایک ہزار دینار انعام میں دے دیے
باقی رقم سے انھوں نے کاروبار شروع کر دیا۔ کچھ دنوں بعد بادشاہ کو فوجی اور اس کے بچوں کا خیال آیا۔ اس نے ان کا حال معلوم کیا تو پتہ چلا وہ بڑے مزے میں ہیں۔ بادشاہ نے ان بچوں کو بلایا
تم نے درخواست دی تھی کہ تمھارے یہاں فاقے ہو رہے ہیں اس لیے مدد کی جائے مگر تم تو عیش کر رہے ہو
یہ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟

بچوں نے سوداگر کے بیٹے کی ایمان داری اور امانت کا پورا واقعہ بادشاہ کے سامنے بیان کر دیا
یہ صحیح ہے کہ ہم پر فاقے گزر رہے تھے، لیکن ہمارے ابّو نے سوداگر کے بیٹے کے پاس دس ہزار دینار رکھوائے تھے
ہمیں اس رقم کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا
جب سوداگر کے بیٹے کو ہماری حالات کا علم ہوا تو اس نے فوراً امانت کی رقم ہمیں دے دی
اسی کی بدولت آج ہم آرام کی زندگی گزار رہے ہیں
سبحان اللہ! جو شخص اتنا ایمان دار ہو کہ اسے امانت سونپنے والا خود مر جائے اور کسی کو اس کا علم نہ ہو...
بادشاہ بہت خوش تھا اور بڑے جوش سے ایمانداری کی تعریف کیے جا رہا تھا
...کوئی گواہ اور کاغذ نہ ہو اور وہ پھر بھی امانت کو اس کے حق دار کے حوالے کر دے، وہ واقعی تعریف کے قابل ہے
بادشاہ نے اسی وقت سوداگر کے بیٹے کو بلایا، اسے بہت سا انعام دیا اور اپنا خزانچی بنا لیا
تو دیکھا بچّو، ایمان داری آخر کیا رنگ لاتی ہے! دراصل ایمان داری اس درخت کی طرح ہے جس پر ہمیشہ میٹھے پھل ہی لگتے ہیں۔ اس لیے پوری طرح ایماندار بننے کی کوشش کرو
ختم شد

بے ایمانی کا انجام

کارٹونسٹ: سید واجد علی شاہ

اس نے تھیلی بادشاہ کو پیش کر دی اور مطمئن ہو کر گھر چلا گیا

بادشاہ کچھ دیر تک غور کرتا رہا آخر اسے ایک تدبیر سوجھی، اس نے فوراً شاہی لباس کا انتظام کرنے والے خادم کو طلب کیا
دیکھو ہمارے لیے کوئی اچھی سی پگڑی لاؤ
پگڑی آئی تو خادم کو بادشاہ نے بہانے سے کسی دوسرے کام سے بھیج دیا اور پگڑی میں چھوٹا سا سوراخ کر دیا۔ خادم واپس آیا تو بادشاہ نے کہا
جاؤ اسے لے جاؤ اور سنبھال کر رکھ دو۔ آج اسے نہیں پہنوں گا
خادم پگڑی واپس لے جا کر رکھ رہا تھا تو اس کی نظر اچانک اس سوراخ پر پڑی۔ سوراخ دیکھ کر وہ بہت گھبرایا اور سوچ میں پڑ گیا۔
یہ بادشاہ سلامت کی سب سے خوب صورت پگڑی ہے اگر انھوں نے سوراخ دیکھ لیا تو میری خیر نہیں
اس نے اپنی پریشانی اپنے ایک ساتھی کے سامنے بیان کی
ارے، اتنا کیوں گھبرا کیوں رہے ہو؟ میں ایک رفو گر کو جانتا ہوں وہ سوراخ کو ایسا رفو کر دے گا کہ کوئی نہیں پہچان سکے گا
رفو گر اپنے کام میں بڑا ماہر تھا اس نے خادم سے منھ مانگے دام لیے اور پگڑی کا سوراخ رفو کر دیا۔ خادم نے پگڑی کو اپنی جگہ رکھ دیا اور اپنے کام میں لگ گیا
دوسرے دن بادشاہ نے وہی پگڑی منگائی اور اسے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھنے لگا
یہ پگڑی کس نے رفو کی ہے؟
یہ سن کر خادم گھبرا گیا

گھبرانے کی ضرورت نہیں
میں نے خود پگڑی میں سوراخ کیا تھا
تم یہ بتاؤ کہ رفو کس سے کرائی؟
خادم نے رفو گر کا پتہ بتا دیا
بادشاہ کے حکم سے رفو گر کو حاضر کیا گیا
یاد رکھو اگر تم سچ سچ بتاؤ گے تو انعام ملے گا، ورنہ جیل جاؤ گے
یہ بتاؤ کہ کیا تم نے اس شہر میں کسی کی تھیلی رفو کی ہے؟
حضور جان کی امان پاؤں تو عرض کیے دیتا ہوں کہ قاضی صاحب نے ایک تھیلی رفو کرائی تھی!
بادشاہ نے اسے تھیلی دکھائی
رفو گر نے اسے پہچان لیا
ہاں حضور! یہی وہ تھیلی ہے جو میں نے رفو کی تھی
بادشاہ نے اس شخص کو اور قاضی کو بلوایا اور رفو گر کے سامنے ان کی بات کرائی
یہ دونوں سچے ہیں اشرفیوں کے لالچ میں مجھ سے یہ گناہ ہو گیا ہے اس کی جو سزا آپ تجویز کریں، مجھے منظور ہے
ہماری نظر میں سب برابر ہیں تمھیں بے ایمانی کی سزا ضرور ملے گی
بادشاہ نے ساری اشرفیاں واپس دلائیں اور بے ایمان قاضی کی جگہ دوسرا قاضی مقرر کر دیا۔
آپ نے دیکھا بچو لالچ انسان کی تمام عزت کو خاک ملا دیتی ہے۔
ختم شد
سید واجد علی شاہ جیلانی، 35 سیوا سدن بلاک ،کمپلیکس 12 فرسٹ فلور، گلی ۔ 1 منڈاوَلی فاضل پور، دہلی۔110092

نظم

عبدالنصیر

سوچو بغیرِ اِن کے کیسی زمین ہوتی؟

سوچو بغیر ان کے
کیسی زمین ہوتی؟
یہ آسماں نہ ہوتا
سایہ زمیں پہ ڈالے
شمس و قمر کی گردش
تاروں بھرے یہ تھالے

ہوتے اگر نہ پربت
دنیا میں سر اٹھائے
پھیلے ہوئے سمندر
گہرائیاں چھپائے

ہوتے نہ اتنے دریا
دھرتی پہ جابہ جا گر
انسان غفلتوں کا
مجموعہ ہوتا اکثر

تالاب اور جھیلیں
پانی کے سب ذخیرے
ان کو نہ جانو کم تر
یہ دوست ہیں ہمارے

بارش کی تیز بوندیں
رم جھم کے یہ نظارے
دل میں بھریں امنگیں
پائیں قرار سارے

دھرتی چھپائے اپنے
سینے میں ہے ذخیرے
پاتے ہیں فیض جن سے
دنیا کے لوگ سارے

کھیتوں میں اگنے والی
فصلیں جو اس قدر ہیں
ساری ضرورتوں سے
انساں کی باخبر ہیں

قدرت کے کھیل ہیں سب
جو دعوتِ نظر ہیں
گنیے جو نعمتوں کو
تو حد سے بیشتر ہیں
سوچو بغیر ان کے
کیسی زمین ہوتی؟

♦ عبدالنصیر، سی۔24 اوکھلا وہار، جامعہ نگر نئی دہلی۔110025

مضمون

مجید بیدار

ڈاکیہ ڈاک لایا

اردو میں استعمال ہونے والا لفظ ڈاک ہندی زبان سے آیا ہے اور ہندی زبان میں یہ لفظ مونث صنف Feminine gender میں استعمال ہوتا ہے۔ لغت میں ڈاک کے معنی ہیں چٹھیاں پہنچانے کا محکمہ۔ ڈاک کے دوسرے معنی سواری بدلنے کی جگہ کے بھی لیے جاتے ہیں اور خبر پہنچانے کے سلسلے کو بھی ڈاک کہا جاتا ہے۔ گھوڑے یا پالکی کو روکنے کی چوکی بھی ڈاک کہلاتی ہے۔ اردو میں سلسلے سے خبر ملنا یا خطوط آنے کو ڈاک آنا قرار دیا جاتا ہے۔ اس لفظ ڈاک سے مل کر بھی کئی لفظ بنتے ہیں۔ مثلاً ڈاک بٹھانا جس کا مطلب ہے ہرکاروں کی آمدورفت جاری رہنا یا چوکی بٹھانا۔ اسی طرح لفظ ڈاک بنگلہ سے مراد ہے سرکاری افسروں کے ٹھہرنے کی جگہ۔ ڈاک خانہ کے معنیٰ پوسٹ آفس یا ڈاک گھر کے لیے جاتے ہیں۔ ایسی گاڑی جس میں ڈاک لائی اور لے جائی جاتی ہے اس کو ڈاک گاڑی کہتے ہیں۔ انگریزی زبان میں

ڈاک Dock کے معنیٰ گودی یا بندر گاہ کے ہوتے ہیں۔ اسی طرح انگریزی میں ڈاک یارڈ Dock Yard کے معنیٰ اس کھلی جگہ کے لیے جائیں گے جہاں جہاز کھڑے ہوتے ہیں اور ان کی مرمت وغیرہ کی جاتی ہے یہ جگہ بندرگاہ کے قریب کی ہوتی ہے۔

ہندوستان، چین، ایران اور مصر میں پرانے زمانے سے ڈاک کا نظام چل رہا ہے۔ اس دور میں سب سے پہلے کبوتر کے ذریعے اور پھر تیز رفتار گھوڑوں اور ان پر سوار ہرکاروں کے ذریعے خط ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کا طریقہ رائج تھا۔ ہندوستان میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے پہلے کے زمانے میں ڈاک کا نظام ترقی پا چکا تھا۔ اشوکِ اعظم کے دورِ حکومت میں 272 قبل مسیح سے 232 قبل مسیح تک ڈاک کا نظام ہی نہیں بلکہ جاسوسی کا نظام بھی جاری تھا۔ اس کے بعد محمود غزنوی نے ہندوستان کے ڈاک کے نظام کو کافی سے زیادہ ترقی دی۔ خاندانِ غلامان کے دور میں ڈاک کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے قصبے اور گاؤں میں وقائع نویس مقرر کیے گئے جو وہاں کا حال چال لکھا کرتے تھے۔ علاالدین خلجی کے دور میں ڈاک چوکی کا انتظام کیا گیا۔ محمد بن تغلق نے ڈاک کی رفتار میں تیزی لانے کے لیے گھوڑ سواری کا انتظام کیا جس میں ہر ایک میل پر پیدل ہرکارے مقرر کیے

گئے اور ہر چار کوس کے فاصلے پر تیز رفتار گھوڑوں کے ذریعے ڈاک کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے کا انتظام کیا گیا تھا۔مشہور سیاح ابنِ بطوطہ نے جب ہندوستان کا رخ کیا تو اس نے اپنے عربی سفر نامے' عجائب الاسفار' میں جسے'سفر نامہ ابنِ بطوطہ' کہتے ہیں، ہندوستان کے ڈاک کے نظام کی بے حد تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ ملک کے کونے کونے سے شہر دہلی میں صرف پانچ دن کے وقفے میں ڈاک پہنچ جایا کرتی ہے۔جب شیر شاہ سوری کا دور شروع ہوا تو اس نے سرائے بنا کر ڈاک کی چوکیاں بٹھائیں اور تیز رفتار ہرکاروں اور گھوڑوں کے ذریعہ ڈاک کے نظام کو بہتر کیا۔اس نے بنگال سے روہتاس تک اور روہتاس سے پنجاب تک دو ہزار پانچ سو ڈاک چوکیاں قائم کیں جس سے ڈاک کے نظام میں بہتری آئی اور ہر قسم کی ڈاک صرف تین دن میں دہلی پہنچ جایا کرتی تھی۔اکبرِ اعظم کے دور سے لے کر ستر ہویں صدی عیسوی تک ڈاک کے نظام میں بہتری آتی گئی جب ہندوستان میں انگریزی عمل درآمد کا سلسلہ شروع ہوا تو برطانوی انداز کے ڈاک کے نظام کا آغاز ہوا۔

ڈاک کے پرانے نظام کے بارے میں مختلف قصّے اور کہانیاں مشہور ہیں جن کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ خط پہنچانے کے لیے پرندوں خاص طور سے کبوتر کا استعمال ہوتا تھا جو اپنے مقام کو اچھی طرح پہچاننے میں باقی پرندوں سے تیز ہوتے ہیں۔چنانچہ کبوتر کے ذریعے خطوط پہنچانے کی روایت سب سے پرانی ہے۔شاعروں نے بھی اس روایت پر بڑے مزے کے شعر کہے ہیں۔مثلاً ایک شعر ہے:

خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر
پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

یہاں بام یار کا مطلب ہے محبوب کا کمرہ۔باقی شعر آسان ہے۔اس کا جواب کسی نے یہ شعر کہہ کر دیا:

خط کبوتر اس طرح لے جائے بامِ یار پر
خط کا مضموں ہو پروں پر، پر کٹیں دیوار پر

کبوتر کا خط لے جانا اور پیغام پہنچانا کوئی فرضی قصہ نہیں بلکہ

انگریزوں کے دور کا ایک ہندوستانی ڈاکیہ

ہندوستان کی سرزمین میں اس کی حقیقت بھی سامنے آئی ہے۔کئی بادشاہوں کے دور میں گھریلو خط ان کے محلوں میں اور شاہی اطلاعات پہنچانے کے لیے کبوتر کا استعمال کیا جاتا تھا۔ہرکارے بھی خط پہنچایا کرتے تھے۔ڈاک کے نظام میں بہتری اس وقت آئی جب ٹرین کے ذریعے ڈاک ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچائی جانے لگی۔ہوائی جہاز کے آغاز کے بعد ڈاک کو ملک میں ہی نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی پہنچانا آسان ہوگیا۔ٹیلیفون کی ایجاد نے اطلاع کے

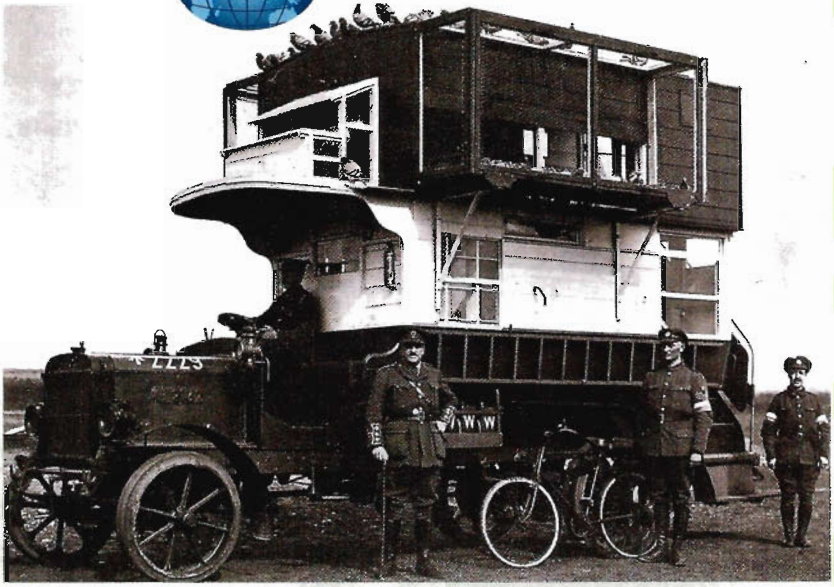

▲ پہلی عالمی جنگ میں کبوتروں کے ذریعے ڈاک پہنچانے والی بس

ڈاک کا جدید نظام جو دنیا بھر میں عام ہے درحقیقت 1839 کی دین سمجھا جاتا ہے، جب انگلستان کی حکومت نے سب سے پہلے برطانیہ میں 1500 ڈاک خانے قائم کیے۔ جنرل پوسٹ آفس 170 کے قریب تھے جن کی نگرانی پوسٹ ماسٹر جنرل کے ذمہ ہوا کرتی تھی انگلینڈ میں ڈاک کے نظام سے نو سال پہلے ہی امریکہ میں اس نظام کو ترقی دی جاچکی تھی ۔وہاں ہزاروں ڈاک خانے قائم تھے۔انگلینڈ میں سب سے پہلے مانچسٹر اور لیور پول کے درمیان رقم ادا کر کے خطوط روانہ کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کے لیے حکومت نے کسی بھی مقام کے فاصلے اور بھیجی جانے والی چیز کے وزن کی بنیاد پر رقم ادا کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ساری دنیا میں نقد رقم دینے کے بجائے ڈاک ٹکٹ کے ذریعے خطوط روانہ کرنے کا نظام سر رولینڈ ہل نے انگلستان میں شروع کیا جس کے تحت خط روانہ کرنے والے پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی کے وہ خط پر مناسب ٹکٹ لگا کر روانہ کرے۔اس ڈاک ٹکٹ کے نظام کا آغاز 1840 میں کیا گیا۔ اس طریقے کے ذریعے فاصلوں کا لحاظ کرتے ہوئے مناسب اور پہنچانے کے طریقے کو مزید آسان کر دیا۔آج کے دور میں مصنوعی سیّاروں کے ذریعے کوئی بھی خبر پل بھر میں دنیا کے کسی بھی خطّے میں پہنچائی جاسکتی ہے۔انٹرنیٹ نے ڈاک کے نظام کی پوری تصویر ہی بدل کر رکھ دی ہے۔ ہر قسم کے خط بہ آسانی آن لائن ہر خطّے میں پہنچائے جاسکتے ہیں۔ پہلے یہ کام طویل عرصے تک ٹیلیگراف کے ذریعے انجام دیا جاتا رہا لیکن اس میں بھی خط کے مضمون کو مورس کوڈ میں بدلنے اور دوسری طرف اس کوڈ کو مضمون بنانے میں کچھ وقت ضرور لگتا تھا۔

ایک شہر سے دوسرے شہر ڈاک پہنچاتے ہوئے تیز رفتار ہرکارے مصور کی نظر سے ◄

▲دھلی کاایک جدید ڈاک خانہ جس میں آگے چل کر بنک کی خدمات بھی جڑ جائیں گی

یکساں قیمت مقرر کر کے ڈاک ٹکٹ استعمال کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ایک عام آدمی کو بھی معمولی ٹکٹ کے ذریعے اپنے خط کو دوسرے مقام تک پہنچانے کی سہولت حاصل ہوگئی۔ ڈاک ٹکٹ خطوط پر چسپاں کر کے روانہ کرنے کا نظام ساری دنیا میں پسند کیا گیا اور اسے سب سے پہلے دنیا میں پھیلانے کا کارنامہ حکومتِ برطانیہ نے انجام دیا۔ دنیا کے دوسرے ملکوں نے بھی انگلینڈ کے اس ڈاک نظام کو پسند کیا اور یہ طریقہ ساری دنیا میں پھیلنے لگا۔ صرف امریکہ جیسے ملک میں اسی ڈاک کے نظام کے ذریعے ساڑھے سات لاکھ ملازمین کو ہر سال حکومت کی طرف سے سہولت فراہم کی جاتی تھی۔ اور ایک اندازے کے مطابق دس لاکھ خط ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچائے جاتے تھے۔ انگلستان کی سرزمین میں ہی سب سے پہلے ہوائی ڈاک کے نظام کا آغاز ہوا جس کے مطابق 10 فروری 1911 کو لندن اور ونڈسر کے درمیان پہلی ایر میل سروس کا آغاز ہوا۔

ڈاک کا نظام اور اس کی سہولتوں کی فراہمی کے معاملے میں ہندوستان کے ڈاک کے نظام کو بہتر تصور کیا جاتا ہے کیوں کے امریکہ جیسے ملک میں ڈاک کی وہ سہولتیں حاصل نہیں تھیں جو ہندوستان میں پرانے ڈاک کے نظام کی وجہ سے موجود تھیں۔ چودھویں صدی کے دوران ہی ہندوستان میں پوسٹ کا نظام رائج تھا جو سولہویں صدی عیسوی تک جاری رہا۔ اسے مغل شہنشاہ اکبر نے شروع کیا تھا۔ 1873 میں امپیریل پوسٹ کا آغاز ہوا۔ ہندوستان کا موجودہ ڈاک نظام 1854 کی یاد دلاتا ہے جب سارے ملک میں یکساں ڈاک کی شرحیں مقرر کی گئیں اور جس کی وجہ سے سارے ملک میں ڈاک کے نظام کو مقبولیت حاصل ہوئی۔ ہندوستان نے عالمی سطح کی یونیورسل پوسٹل یونین کی ممبرشپ کو 1876 میں قبول کیا 1870 تک لگ بھگ سارے ملک میں ریلوے میل کے ذریعے خط پہنچانے کے نظام کو عام کیا گیا جس کی وجہ سے ڈاک کی خدمات میں ترقی ہونے لگی اور خط بروقت مقررہ مقام پر پہنچانے کی سبیل نکل آئی اس طرح ڈاک کے نظام نے ریلوے کے علاوہ ہوائی جہاز سے بھی استفادہ کر کے عوامی خطوط کو ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔ اس ترقی یافتہ دور میں بھی ہندوستان جیسے ملک میں سائیکل سوار ہرکارے نہ صرف دیہات میں بلکہ بڑے شہروں کے مختلف محلوں میں روزانہ ڈاک تقسیم کرتے نظر آتے ہیں۔ اس طرح سارے ملک میں روزانہ ڈاک کی تقسیم کا ہی نہیں بلکہ ہفتہ واری تقسیم کا سلسلہ بھی جاری ہے۔ انٹرنیٹ اور پرائیویٹ کوریئر سروس آجانے کے باوجود روایتی انداز سے ڈاک کی تقسیم کے سرکاری نظام کو ملک کا قیمتی ورثہ سمجھا جاتا ہے جس پر ہمیں فخر ہے کیونکہ آج بھی اس کی گنتی دنیا کے سب سے بڑے ڈاک کے نظاموں میں کی جاتی ہے۔ □

♦پروفیسر مجید بیدار سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

چلی چلی رے پتنگ

□ بانو سرتاج

آسمان میں اڑتی ہوئی پتنگ کسے اچھی نہیں لگتی۔ ڈور اور ہوا کے زور پر فضا میں ناچتی ہوئی رنگ برنگی پتنگیں دلوں میں عجیب سا جوش اور امنگیں بھر دیتی ہیں۔ پتنگ بازی ایک بہترین مشغلہ اور عمدہ تفریح ہے۔ دوسرے کھیلوں کی طرح اس میں بھی مہارت حاصل کر کے نام کمایا جاسکتا ہے۔

پتنگ بازی کی تاریخ کم از کم ڈھائی ہزار سال پرانی ہے۔ چین سے اس کا آغاز مانا جاتا ہے۔ کہتے ہیں ایک چینی کسان نے ہوا سے اڑتی ٹوپی کو ڈور سے باندھ لیا تھا۔ ایک مرتبہ ہوا کا تیز جھونکا ٹوپی کو ڈور سمیت اڑا لے گیا۔ کسان نے ڈوری کی مدد سے اپنی ٹوپی کو نیچے کھینچا اور یہی واقعہ پتنگ کی ایجاد کا سبب بنا۔ کہتے ہیں چینی فلسفیوں موزی Mozi اور لو بان Lu Ban نے حضرت عیسیٰ سے پانچ سو سال پہلے کے زمانے میں پتنگ بنائی تھی۔ پتنگ بنانے کا تمام سامان جیسے ریشم کا کپڑا، ریشم کی مضبوط ڈوری، ہلکا اور مضبوط بانس چین میں دستیاب تھا اس لئے وہاں پتنگوں کو خوب رواج ملا۔ چین میں پتنگوں کو مختلف ڈیزائنوں اور مختلف شکلوں میں بنایا جاتا ہے۔ مثلاً چڑیا، تتلی، مچھلی، سانپ، اژدہے، ڈریگن کی شکل کی پتنگیں بنائی جاتی ہیں، جن میں ڈریگن پتنگ سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ پتنگ عموماً چالیس پچاس فیٹ لمبی ہوتی ہے۔ اس پتنگ کو کئی اشخاص مل کر اوپر پہنچاتے ہیں۔ اوپر پہنچنے پر ہوا کی وجہ سے اس میں عجیب وغریب آواز نکلتی ہیں، جنہیں سن کر بچے بے حد خوش ہوتے ہیں۔

چین میں سال کے نویں مہینے کے نویں دن 9 ستمبر کو پتنگ بازی کا دن منایا جاتا ہے۔ جشن جیسا ماحول ہوتا ہے۔ تمام آسمان رنگ برنگی پتنگوں سے بھر جاتا ہے۔ مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ انعام تقسیم کئے جاتے ہیں۔ چین میں پتنگوں کے ساتھ کئی عقیدے بھی وابستہ ہیں۔ گنگ خاندان کے دور میں ہوا میں لڑتی پتنگوں کو یوں ہی چھوڑ دینا برا سمجھا جاتا تھا۔ چینی لوگوں کا خیال تھا کہ ہوا میں لٹکی پتنگیں بدقسمتی اور بیماریوں کو دعوت دیتی ہیں۔ دوسری طرف کٹی پتنگ کو لوٹنا بھی برا تھا۔

چین سے بودھ سادھوؤں کے ذریعہ، پتنگ جاپان، برما، ملیشیا، انڈونیشیا ہوتے ہوئے بھارت پہنچی۔ جاپان میں پتنگ کو 'شر وشی' کہا جاتا ہے شِر یعنی کاغذ اور شی یعنی پرندہ۔ شروشی کا مطلب ہوا کاغذی پرندہ۔ جاپان میں مئی کی پہلی اور دوسری تاریخ کو پتنگ بازی کا باقاعدہ تہوار منایا جاتا ہے۔ عیدو ندی کے کنارے جم غفیر نظر آتا ہے

چودہ، پندرہ میٹر لمبی اور 800 کلوگرام وزنی صرف دو پتنگیں اڑائی جاتی ہیں۔ میدان میں موجود لوگ ان پتنگوں سے لطف حاصل کرتے ہیں۔ 1760 میں جاپان میں پتنگ بازی پر پابندی لگادی گئی تھی کیونکہ لوگ کام سے زیادہ وقت پتنگ بازی کو دینے لگے تھے۔ بڑی پتنگیں بنانے اور اڑانے پر بھی پابندی لگائی گئی تھی کیونکہ ایک چور شاہی محل کی اونچی دیوار پتنگ کی مدد سے پھلانگ کر محل میں گھس گیا تھا۔

ہندوستانی ترنگے سے ملتے جلتے کویت کے قومی پرچم کے رنگوں پر بنائی گئی لمبی چوڑی دوھری پتنگ کو اڑانے کی کوشش کا ایک منظر

تھائی لینڈ کے بنگاک شہر میں فروری سے اپریل تک پتنگوں کا موسم ہوتا ہے۔ پتنگ بازی کے مقابلے کرائے جاتے ہیں۔ فاتح پتنگ بازوں کو بڑے بڑے انعامات ملتے ہیں۔ تھائی لینڈ میں پتنگ بازی کو مذہب سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ ہر راجہ کی اپنی مخصوص پتنگ ہوتی تھی جسے جاڑے میں بھکشو اور پروہت وغیرہ مذہبی رسم کے طور پر ملک میں امن اور خوش حالی کے لیے اڑاتے تھے۔ تھائی باشندے خدا تک اپنی درخواستیں پہچانے کے لئے بھی پتنگوں کا استعمال کرتے ہیں۔ کوریا میں پتنگ پر نومولود بچے کا نام اور تاریخ پیدائش لکھ کر اڑایا جاتا ہے۔ تاکہ بچے کی بدقسمتی پتنگ کے ساتھ اڑ جائے اور بچہ محفوظ رہے۔

مارکو پولو نے جو چین کے کئی سفر کر چکا تھا یوروپ میں 1282 میں پتنگ بازی کو فروغ دیا جہاں وہ ایک تفریح نہ رہ کر سائنسی ایجادات کا ذریعہ بنی اور فوجی معاملات میں مددگار ثابت ہوئی۔ نیوزی لینڈ کے عوام کا پتنگ بازی محبوب مشغلہ ہے۔ وہاں کی گانے والی پتنگیں بطور خاص مشہور ہیں۔ پتنگ بناتے وقت نرم بانس کے سوراخ شدہ ٹکڑوں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ بلندی پر پہنچ جانے کے بعد

◄عام ہندوستانی پتنگیں

جب ان سوراخوں سے ہوا گذرتی ہے تو بانسری جیسی موسیقی سنائی دیتی ہے۔ نیوزی لینڈ میں بھی پتنگوں کو مذہبی حیثیت حاصل ہے۔ ماأوری قبیلے میں پتنگ کے بھجن لکھے جاتے ہیں۔ قبیلہ کے مکھیا کی موجودگی میں پتنگیں اڑائی جاتی ہیں۔ سب مل کر پتنگ کے بھجن گاتے ہیں۔

جاپان کے بعد پتنگ بازی بھارت پہنچی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستانی تہذیب میں رچ بس کر 14 جنوری کے 'مکر سنکرانت' کے تہوار سے وابستہ ہوگئی۔ مکر سنکرانت کا تہوار سورج کی پوجا سے تعلق رکھتا ہے۔ جنوری، فروری میں پتنگ بازی عروج پر ہوتی ہے۔ بھارت میں زمانہ قدیم میں بادشاہ، نواب، راجہ مہاراجہ پتنگ بازی کے شائق تھے۔ اس شوق پر لاکھوں روپیہ خرچ کردیتے تھے۔ جے پور کے مہاراجہ خاص خاص موقعوں پر خود پتنگ اڑاتے تھے۔ ایک پتنگ میں ڈھائی تولہ سونے کی گھگھری باندھی جاتی۔ اس پتنگ کو کاٹنے میں جو کھلاڑی کامیاب ہوتا وہ اس گھگھری اس کی ہوجاتی۔

ہمارے یہاں پتنگ بازی کی حوصلہ افزائی کے لئے 'بھارتیہ پتنگ بازی مہاسنگھ' قائم کیا گیا ہے۔ بھارت سرکار نے ملکی سطح پر اس کھیل کو منظوری دی ہے۔ غیر ممالک میں ہندوستانی پتنگیں بے حد پسند کی جاتی ہیں۔ وہاں انہیں 'لڑاکا پتنگیں' کہا جاتا ہے۔ راج دھانی دلی میں خاص موقعوں پر پتنگیں اڑائی جاتی ہیں۔

انگریزی میں پتنگ کو کائٹ Kite کہتے ہیں۔ کچھ علما کا خیال ہے کہ یونان کے ٹرینٹم آر کائٹس Traintum R-Kite نے دنیا کی پہلی پتنگ بنائی تھی اس لئے اس کے نام پر کائٹ نام رکھا گیا۔ بھارت کی مختلف زبانوں میں پتنگ کے مختلف نام ہیں، جیسے بنگالی میں گڈی، اڑیہ میں گھڑی، تمل میں گڈی یا چنگ، اردو میں کن کیا اور پتنگ۔ مراٹھی کے سنت کوی نام دیو نے اپنی شاعری میں پتنگ کے لئے گڈی اور سنت ایکناتھ اور سنت تکارام نے 'باوڑی' لفظ استعمال کیا ہے۔ پتنگ لفظ سب سے پہلے ہندی کے شاعر منجھن نے استعمال کیا اور وہی لفظ آج تک رائج ہے۔

پتنگ تفریح کا ذریعہ تو ہے ہی مختلف زمانوں اور مختلف ملکوں میں اس کا اور بھی بہتر استعمال کیا گیا۔ پیغام رسانی، جنگی ہتھیار، سائنسی ایجادات وغیرہ میں پتنگ کی مدد لی گئی۔ ایسے چند واقعات پر نظر ڈالتے ہیں۔ چین کے ہان نسل کے بادشاہ لی یو ہانک Lee Yu Hawnk نے جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے پتنگ کا استعمال کیا۔ اس کی حریف فوج جاہل اور وہمی تھی۔ بادشاہ نے سیکڑوں پتنگوں میں سیٹیاں بندھوا کر رات کے اندھیرے میں حریف کی فوج کے ڈیروں کی طرف اڑا دیں۔ ہوا سے سیٹیوں کی عجیب غریب آوازیں نکلنے لگیں جنہیں بھوت پریت کی آوازیں سمجھ کر دشمن فوج خوف زدہ ہوگئی اور میدان چھوڑ کر بھاگ گئی۔

حضرت عیسیٰ سے 600 سال پہلے کوریا کی جنگ میں ایک رات فوج کے سپاہیوں نے ایک تارا ٹوٹتے دیکھا اور ان کے دلوں میں یہ خیال جڑ پکڑ گیا کہ یہ بدشگونی ہے۔ ان کے جنرل کو خبر ملی تو نہایت عقل مندی سے کام لیتے ہوئے اس نے پلان بنایا۔ آگ کا ایک روشن گولا رات کے اندھیرے میں پتنگ کے سہارے آسمان میں بھیج دیا اور خبر پھیلا دی کہ ٹوٹا ہوا تارا واپس آ گیا ہے۔ سپاہی مطمئن ہوگئے اور جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ ایک اور واقعے میں کوریائی فوج کے سپہ سالار نے اپنی فوج کے قدم اکھڑتے دیکھے تو ایک ترکیب کی۔ اس نے افواہ پھیلا دی کہ جنگ میں فتح یابی کے لئے دعا کی گئی ہے۔ جلد ہی ایک آسمانی طاقت ان کی مدد کے لئے آنے والی ہے۔ سپہ سالار نے پتنگوں میں سیکڑوں لالٹین بندھوا کر آسمان میں اڑا دیں۔ جلتی ہوئی

احمدآباد کے عالمی پتنگ میلے میں اڑتی ہوئی پتنگیں ▲

قندیلوں کو دیکھ کر جہاں اس کی فوج آسمانی مدد کے آنے سے خوش ہوگئی وہاں دشمن فوج خوف زدہ ہوکر پیچھے ہٹ گئی۔ ایک جنگ کے دوران فوج کا ایک دستہ آگے بڑھ رہا تھا کہ سامنے ایک نالا آ گیا۔ سپاہی اسے پار کرنے میں ہچکچانے لگے کیونکہ نالے کی چوڑائی کا کچھ اندازہ ہی نہیں ہو رہا تھا۔ پتنگیں اڑا کر دوسرے کنارے پر گرائی گئیں اور ڈور کی لمبائی سے نالے کی چوڑائی کا اندازہ کر کے نالا پار کیا گیا۔

1662 میں مغل سپہ سالار شائستہ خان نے پونے میں چاکن قلعہ کی گھیرابندی کر رکھی تھی۔ ایک ہزار فٹ اونچی پہاڑی پر واقع اس قلعہ کو

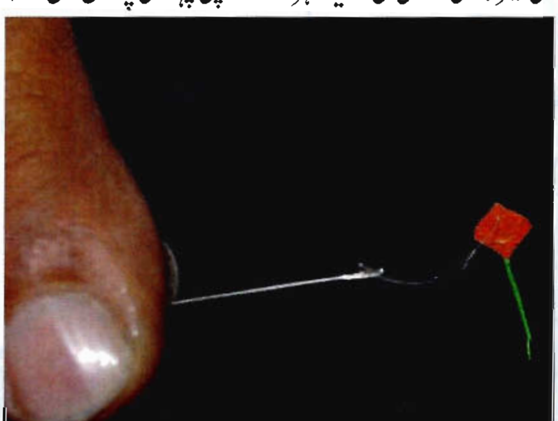

▲ایک ملی میٹر کی دنیا کی سب سے چھوٹی پتنگ، جس کے خالق اودے پور راجستھان کے اقبال سقہ(تصویر بائیں جانب) اس کے علاوہ بھی کئی عالمی ریکارڈ بنا چکے ہیں

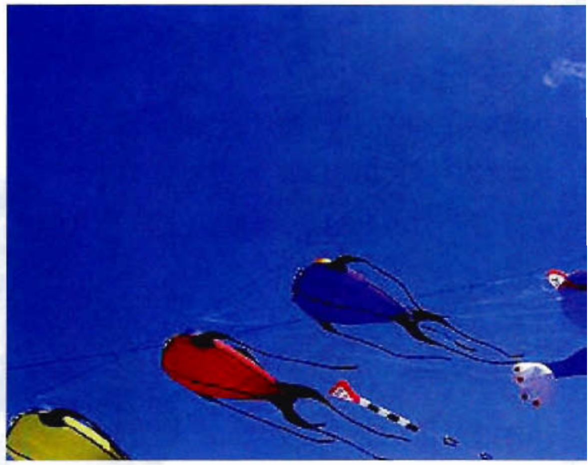

فتح کرنا آسان نہ تھا۔ شائستہ خان نے بڑی بڑی پتنگیں تیار کروائیں اور ان کی دم میں جلتی ہوئی مشعلیں باندھ کر اڑائیں اور قلعہ میں گرا دیں، قلعہ میں موجود بارود کے ذخیرہ میں آگ لگ گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں سپاہی مارے گئے، جو بچے، انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

چین کے ہے اِس Heyis بادشاہ نے جنگ کے دوران محل سے فوج کا فاصلہ معلوم کرنے کے لئے پتنگوں کی مدد لی تھی۔ 1066 میں ہٹینگس Hestings کی جنگ میں جو انگلینڈ اور نارمن لوگوں کے درمیان ہوئی تھی، برٹش فوجیوں کو پتنگوں کے ذریعہ جنگ کے قاعدے قانون سمجھائے جاتے تھے۔ 500 عیسوی میں چینی بادشاہ لیونگا Leonga نے پتنگوں سے خبر سانی کا کام لیا تھا۔ 1814 میں مارکونی نے پتنگ کی مدد سے اٹلانٹک سمندر کے پار ریڈیو سندیش بھیجا تھا۔

سائنسی ایجادات میں پتنگیں بہت کام آئیں۔ مثلاً:

● 1742 میں گلاسگو اسکاٹ لینڈ، کے سائنس دانوں الیگزنڈر ولسن اور ٹامس سیل وین نے پتنگ میں تھرمامیٹر باندھ کر مختلف مقامات کی آب وہوا ریکارڈ کی۔ ● 1752 میں بنجامن فرینکلن نے برسات کی ایک رات میں تانبے کے تار میں باندھ کر پتنگ اڑائی اور ڈور میں بندھی چابی کو چھوکر بادلوں میں چمکنے والی بجلی کی شدت کو ناپا۔ ● 1866 میں جارج پیکاک نے دو بڑی پتنگوں کو ایک بگھی میں جوت کر پتنگیں ہوا میں اڑا دیں۔ پتنگیں بگھی کو لے کر تئیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑیں۔ اس نے سمندری حادثوں میں پھنسے جہازوں اور ملاحوں ومسافروں کو بچانے میں پتنگوں کا استعمال کیا۔ ● 1833 میں ڈگلس آرکی ویلڈ Duglus Archiweild نے پتنگ کے ساتھ وِنڈ میٹر باندھ کر 1200 میٹر اوپر بہتی ہوئی ہوا کی رفتار کو ناپنے میں کامیابی حاصل کی۔ ● 1847 میں ایک دس سالہ بچے نے نیاگرا ندی کے آر پار پتنگ اڑائی جس نے نیاگرا ندی پر پل بنانے کے خیال کو جنم دیا۔ ● 1887 میں ڈگلس آرکی ویلڈ نے پتنگ کے ساتھ کیمرہ باندھ کر اونچائی سے تصاویر کھینچنے میں کامیابی حاصل کی۔ ● 1888 میں امریکہ کے محکمہ موسمیات نے خاص پتنگوں میں کیمرہ اور دوسرے ضروری آلات باندھ کر اہم خلائی معلومات حاصل کیں۔

آج خلائی سفر ممکن ہوگیا ہے۔ ہوائی اڑانیں عام ہوگئی ہیں۔ پتنگوں نے انسان کے اس کارنامے میں بھی حصہ لیا۔ ● 1844 میں سوئزلینڈ کے کالاڈون نے 15 پاؤنڈ وزنی پتلے کو کرسی میں بٹھا کر پتنگ کے ذریعہ 656 فٹ کی اونچائی تک اڑایا تھا۔ ● 1804 میں ہوائی جہاز کے فادر کہے جانے والے جارج کیلی نے تجرباتی گلائیڈر بنانے کے لئے اونچی کمان والی پتنگ بنائی۔ اس واقعہ کے کئی سال بعد دنیا کا پہلا گلائیڈر وجود میں آیا۔ 1870 میں آسٹریلیا کے لارنس ہارگین Lawrence Hargane کے تجربات نے بیسویں صدی میں ہوائی جہاز کی ایجاد میں اہم رول نبھایا۔ رائٹ برادرز نے بھی ابتدا میں پتنگوں کے ذریعہ ہی آسمان میں اڑنے کی کوشش کی تھی۔

◄ اودے پور راجستھان کے عالمی ریکارڈ یافتہ پتنگ بازمرحوم عبدالملک جنھوں ایک ہی ڈور سے 500 پتنگیں اڑا کر عالمی ریکارڈ بنایا اور کئی قومی ریکارڈ توڑے۔ دنیا بھر میں مشہور عبدالملک گردے خراب ہونے کی وجہ سے 38 سال کی مختصر عمر میں انتقال کر گئے۔ اب ان کی ننھی بیٹی سارہ پتنگ اڑانا سیکھ رہی ہے۔

پتنگ بازی ایک بین الاقوامی کھیل ہے اوراس مناسبت سے اس کھیل میں ریکارڈ بھی بنے ہیں۔● 1936 میں دنیا کی سب سے بڑی پتنگ ایک جاپانی نے بنائی تھی۔● 1981 میں گیرٹ بیڈر Garrat Badar نے نائیلون کی 230 کلوگرام وزنی پتنگ تیار کی۔ یہ دنیا کی سب سے وزنی پتنگ مانی جاتی ہے۔ یہ پتنگ 40 میٹر کی اونچائی پر 37 منٹ تک اڑی تھی۔● 1969 میں ایک امریکی پتنگ باز نے 10830 میٹر کی اونچائی تک پتنگ اڑا کر اونچی اڑان کا ریکارڈ قائم کیا۔● نیچی اڑان (صرف 15 سینٹی میٹر) کا ریکارڈ بھارت کے سریندر بہادر کے نام ہے۔● 1919 میں جرمنی کے ایک پتنگ باز نے 8 پتنگوں کی زنجیر کو 31955 فٹ اونچائی تک اڑایا تھا۔ 1980 میں ایک جاپانی نے ایک ڈوری میں 8 سے 10 فٹ کے فاصلے پر 250 پتنگیں باندھ کر اڑائی تھیں۔● جے پور کے پتنگ باز عبدالملک نے 'جے پور انٹرنیشنل کائٹ فیسٹی ول' میں ایک ڈور سے 500 پتنگیں باندھ کر اڑانے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا۔● 1977 میں فلوریڈا کے پتنگ باز نے مسلسل 169 گھنٹوں تک پتنگ اڑانے کا ریکارڈ قائم کیا۔● ہوا کے بغیر ریموٹ کنٹرول سے پتنگ اڑانے کا ریکارڈ انگلینڈ کے کیوویل Que Well نے قائم کیا۔ ایلی ویٹر اور چھوٹے ایئر کرافٹ کی طرز کے انجن سے اس نے پتنگ کو فضا میں بلند کیا۔ کیوویل میدان کے ایک گوشے میں کھڑا ہو کر پتنگ اڑاتا رہا۔ دیکھنے والوں کو پتہ ہی نہ چلا کہ پتنگ کون اڑا رہا ہے۔

پتنگ کے میوزیم بھی بنائے گئے ہیں۔ جاپان کے میوزم میں 2500 سے زیادہ قسموں کی پتنگیں موجود ہیں۔ بھارت کی گجرات کے احمد آباد شہر میں دنیا کا سب سے بڑا پتنگ میوزیم بنایا گیا ہے۔

1989 سے احمد آباد میں بین الاقوامی پتنگ بازی کے مقابلے منعقد ہوتے ہیں۔ 1984 سے چین میں ہر سال بین الاقوامی 'پتنگ جشن' ہوتا ہے۔ دنیا کے کئی ملکوں میں 27 نومبر Fly a Kite Day یا 'یوم پتنگ' کے طور پر منایا جاتا ہے۔

آخر میں یہ سوال ذہن میں آتا ہے کہ پتنگ آخر اڑتی کیسے ہے؟ پتنگ دراصل ڈور سے بندھا ہوا ہوائی جہاز ہے جس کے اوپر ہوا کا دباؤ کم ہوتا ہے اور نیچے زیادہ۔ یہی دباؤ پتنگ کو ہوا سے بھاری ہونے پر بھی اوپر اٹھا دیتا ہے۔ ہوا سے ہلکی کچھ پتنگیں ہوتی ہیں جو ہوائی دباؤ کے بغیر بھی اڑ سکتی ہیں۔

لیکن آج کل پتنگ کا شوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ مصروف زندگی، کرکٹ کی بے پناہ مقبولیت اور بچوں کا دن رات ٹیلی ویژن سے چپکا رہنا اس کے اہم سبب ہیں۔ □

♦ ڈاکٹر بانو سرتاج، بالمقابل آکاشوانی، سول لائن چاند پور۔ 442401 مہاراشٹر

□ متین اچل پوری

باغ میں پھول ہیں کھلے

باغ میں پھول ہیں کھلے
حسبِ معمول ہیں کھلے
تازہ تازہ گلاب ہے
پھول یہ لاجواب ہے
دو قدم پر ملا کنول
حوض میں ہے کھلا کنول
یہ چنبیلی کی بیل ہے
خوب قدرت کا کھیل ہے
رنگ چمپا بکھیرتا
موتیا دل کو گھیرتا
موگرا دل لبھاتا ہے
خوب خوشبو لٹاتا ہے
کیوڑے سے مہک اٹھی
واہ! کوئل چہک اٹھی
دھوپ سورج مکھی پہ ہے
روپ سورج مکھی پہ ہے
شان بیلے کی دیکھنا
پھول میلے کی دیکھنا

سرخ جاسندی جا بجا
دے رہی ہے بڑا مزہ
جو ہی کیا کیا اثر کرے
پھول یہ دل میں گھر کرے
رات رانی بھی خوب ہے
یہ دوانی بھی خوب ہے
زرد گیندا، کنسیر ہیں
خوب پھولوں کے ڈھیر ہیں
سبز ہریالی دیکھنا
ناز کی پالی دیکھنا
کیا گھنیرے درخت ہیں
گویا پھولوں کے تخت ہیں
رنگ پھلواریوں کے ہیں
سنگ پھلواریوں کے ہیں
خوشنما پھول ہیں کھلے
حسبِ معمول ہیں کھلے

♦ متین اچل پوری، اچل پور، ضلع امراوتی، مہاراشٹر۔ 444806.

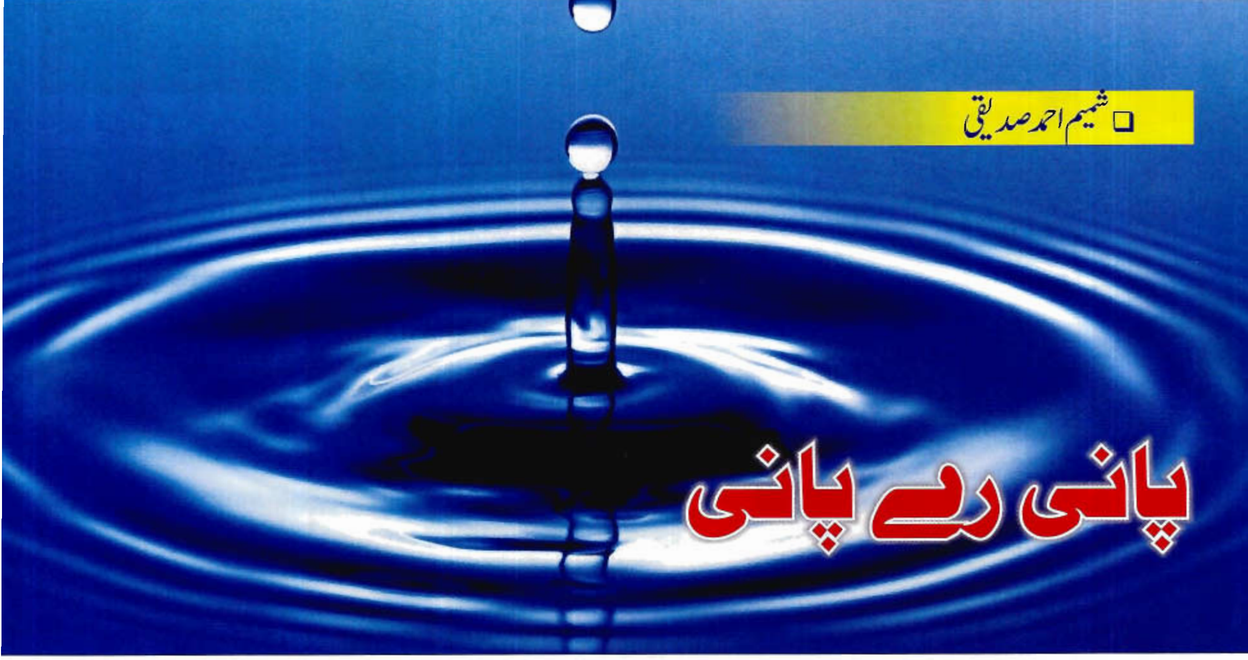

پانی رے پانی

شمیم احمد صدیقی

اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ ہم اپنے قریبی دوستوں کی عادت واطوار کے بارے میں بہت سی ایسی باتیں جانتے ہیں جو عام لوگ ان کے بارے میں نہیں جانتے لیکن یہ ایک کڑوی سچائی ہے کہ ہم اپنے ایک ایسے اچھے دوست کے بارے میں جو دن بھر ہماری خدمت میں لگا رہتا ہے اور جس کی مدد سے ہم بہت سے ضروری کام انجام دیتے ہیں، بہت کم واقفیت رکھتے ہیں۔ پانی ہمارا ایک ایسا ہی دوست ہے جس سے ہم دن رات خوب فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن جس کے بارے میں ہماری معلومات بہت ادھوری ہیں۔

ہم اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہر جان دار کو زندہ رہنے کے لیے غذا یا کھانے کی ضرورت بھی پڑتی ہے اور پیاس بجھانے کے لیے پانی کی بھی۔ قدرت نے ہر جاندار کی بھوک مٹانے کے لیے اس دنیا میں مناسب غذا پیدا کرنے کے ساتھ ہی اس کی پیاس بجھانے کے لیے بڑی مقدار میں پانی بھی پیدا کیا ہے۔ زمین کے گولے پر جتنے بھی پہاڑ، ٹیلے، جنگلاور میدان وغیرہ ہیں وہ زمین کا صرف انتیس فی صد حصہ ہیں۔ باقی اکہتر فیصد زمین پانی سے بنی ہے جو زمین کے اندر اور اوپر برفیلی چوٹیوں ندیوں سمندروں جھرنوں جھیلوں اور تالابوں کی شکل میں نظر آتا ہے۔ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جسم میں بھی پانی کا یہی تناسب ہے۔ یعنی 29 فیصد گوشت کھال اور ہڈّیاں اور 71 فیصد پانی۔ انسانی زندگی کے لیے پانی کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ آدمی بغیر کھانا کھائے کئی ہفتہ تک زندہ رہ سکتا ہے جبکہ بغیر پانی پیے ایک ہفتہ تک زندہ رہنا محال ہے۔ انسان کے علاوہ دیگر جاندار مثلاً چڑیاں، بلی، بندر، کتا، بکری، گائے، بھینس وغیرہ پانی کو صرف پیتے ہیں جب کہ انسان پینے کے علاوہ منہ ہاتھ دھونے، نہانے، برتن، کپڑے، کاریں اور دوسری گاڑیاں دھونے، کھانا پکانے، مکان بنانے، باغوں اور کھیتوں میں سینچائی کے لیے بھی پانی کا استعمال کرتا ہے۔

زندگی اور صحت کے لئے پانی کی اہمیت کا احساس کرتے ہوئے انسان نے اپنی بستیاں جھیلوں اور ندیوں کے کنارے بسائیں۔ ہندوستان کے تمام قدیم شہر ندیوں کے کنارے ہی آباد ہیں۔ جیسے اتر پردیش کا اجودھیا سریو ندی کے کنارے ہے، احمد آباد سابرمتی کے کاشی، گنگا کے دہلی، جمنا کے اور آسام کا ڈبروگڑھ، برہم پتر کے کنارے بسا ہوا ہے۔ گومتی کے کنارے لکھنؤ، گوداوری کے کنارے ناسک اور کرشنا کے کنارے وجے واڑہ بھی ایسے ہی شہر ہیں۔ باقی دنیا میں بھی وولگا کے کنارے ماسکو اور سینٹ پیٹرز برگ، نیل کے کنارے قاہرہ، ٹیمز کے کنارے لندن، دجلہ کے کنارے بغداد، جیسے بہت سے شہر بہت سے دریاؤں کے کنارے بسے ہیں۔ مقدس تاریخی شہر مکہ معظّمہ کسی دریا کے کنارے آباد نہیں لیکن مذہبی روایتوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو زیر زمین پانی کے قدرتی سرچشمے زم

زم کے نمودار ہونے سے پہلے وہاں ویرانہ تھا۔

قدرت نے پانی کو صاف رکھنے کا بڑا عمدہ انتظام کر رکھا ہے۔ گندہ پانی بھاپ کی شکل میں تبدیل ہوکر گیس کی مانند اوپر جاکر بادل میں تبدیل ہوجاتا ہے اوراس طرح پانی میں گھلی ہوئی گندگیاں یا اس میں شامل نہ گھلنے والی گندگیاں سب زمین پر رہ جاتی ہیں۔ ماحول سازگار ہونے پر بادل سے پانی کی بوندیں بارش کی صورت میں زمین پر برستی ہیں اور ہم صاف ستھرا معطر پانی Distilled water استعمال میں لاسکتے ہیں۔ زمین کچی ہونے پر بارش کا پانی مٹی میں جذب ہوکر نیچے اتر جاتا ہے اور گہرائی پر موجود کسی چٹان پر اسی طرح اکٹھا ہوجاتا ہے جس طرح ہم پانی کو اپنے گھروں میں موجود ٹنکیوں میں اسٹور کرتے ہیں۔ انھیں قدرتی ٹنکیوں سے ہم ہینڈ پمپ یا ٹیوب ویل کے ذریعہ صاف ستھرا پانی اوپر لاکر اپنے استعمال میں لاتے ہیں۔ اب یہ بات دانشمندی کے خلاف ہی کہی جائے گی کہ ہم نے ترقی کے نام پر شہروں کی بیشتر زمین کو پکا کردیا ہے جس کی وجہ سے بارش کا پانی مٹی میں جذب ہونے کے بجائے سڑکوں پر بہہ کر پہلے نالیوں میں پھر نالوں میں اورآخر میں کسی ندی وغیرہ میں جاکر مل جاتا ہے۔ اسی لیے شہروں میں زمین کے نیچے موجود پانی کی مقدار گھٹتی جاتی ہے اوراس کی سطح نیچے گرتی جاتی ہے جس سے شہر کے ہینڈ پمپ وغیرہ بیکار ہوجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں میونسپل بورڈ کو خاسی دوری پر واقع کسی ندی یا جھیل سے پانی لاکر شہری باشندوں کو سپلائی کرنا پڑتا ہے۔ دیہات کے باشندوں کو پانی حاصل کرنے کے لیے ہینڈ پمپ چلانے یا کنویں سے پانی کھینچنے میں جسمانی مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے اس لیے وہ پانی کو احتیاط سے خرچ کرتے ہیں۔ شہری باشندوں کو واٹر ورکس یا نجی موٹر کے ذریعہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے پانی دستیاب ہوتا ہے لہٰذا اکثر وہ اس کو بڑی لاپروائی سے خرچ کرتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد اوپر ذکر کی گئی پریشانی میں مبتلا ہوتے ہیں۔

تمام حیوانات کے لئے انتہائی لازمی شے پانی سائنس کے اعتبار سے کیا ہے؟ سائنسدانوں نے اپنے تجربات سے یہ ثابت کیا ہے کہ پانی دراصل ہائیڈروجن اور آکسیجن نام کی دو گیسوں سے مل کر بنا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ ہائڈروجن جلنے والی گیس ہے اور آکسیجن دوسری چیزوں کو جلاتی ہے۔ مگر ان دونوں کے ملنے سے جو پانی بنتا ہے وہ آگ کو بجھا دیتا ہے۔ آکسیجن وہ گیس ہے جو خاصی مقدار میں ہوا میں شامل ہوتی ہے اور ہمارے سانس لینے پر پھیپھڑوں میں پہنچ کر خون میں شامل ہوجاتی ہے اور خون کی گردش کی بنا پر جسم کے ہر حصہ میں پہنچ کر زندگی کو باقی رکھنے میں اہم رول ادا کرتی ہے۔

گذشتہ لگ بھگ سو سال سے سائنسداں اس تگ و دو میں لگے ہیں کہ پانی سے ہائیڈروجن گیس حاصل کرنے کا کوئی آسان اور سستا طریقہ دریافت ہوجائے تاکہ پٹرول، ڈیزل یا سی این جی کی جگہ ہائیڈروجن کو بطور ایندھن استعمال کیا جاسکے۔

دھلی میں جمنا کا کیچڑ اوراس میں اشنان کاناقابل یقین تصور

پانی میں ایک عجیب صفت اور ہے۔ دیگر تمام سیال مادے ٹھنڈک کے اثر سے سکڑتے ہیں۔ اور منجمد یعنی ٹھوس بننے پر ان کے بھاری پن میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اور وہ اپنے سیال میں ڈوب جاتا ہے جبکہ پانی سے برف بننے پر بجائے سکڑنے کے وہ بڑھ جاتا ہے جس کی بنا پر برف کا وزن پانی سے کم ہوجاتا ہے اور برف کا زیادہ تر حصہ پانی میں ڈوب کر بھی تیرتا رہتا ہے۔

پانی کی اس انوکھی صفت کی وجہ سے جاڑوں کے موسم میں جھیلوں اور سمندر وغیرہ کی اوپری سطح برف میں تبدیل ہوجاتی ہے جو سردی کو مزید نیچے پہنچنے سے روک دیتی ہے اور برف کی تہہ کے نیچے پانی میں موجود مچھلیاں، کیکڑے اور دیگر آبی جانور مرنے سے بچ جاتے ہیں۔ □

♦ ڈاکٹر شمیم احمد صدیقی C-2، نسیم منزل، میڑگنج، پولیس پوسٹ، سیتاپور روڈ، لکھنؤ۔226020

نظم

خاور نقیب

پرندوں کی جنت

ایشیا کی سب سے بڑی Brackish Water Lake یعنی کھارے پانی کی جھیل 'چلکا جھیل' کے نام سے مشہور ہے اور صوبہ اُڑیسہ میں واقع ہے جس کا نیا سرکاری نام اوڈیشا Odisha ہے۔ 1,100 سکوائر کلومیٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی یہ جھیل دراصل اتکل اوڈیشا میں بنگوپ ساگر کی سہیلی جیسی ہے۔ یہاں سائبیریا، منگولیا، سنٹرل ایشیا، لداخ اور ہمالیائی خطوں سے آئے ہوئے ہزاروں مسافر پرندے اپنے علاقوں کی سخت سردی سے بچنے کے لیے آتے ہیں اور اس علاقے کو جنّت بنا دیتے ہیں! کبھی موقع ملے تو یہ بے نظیر جھیل ضرور دیکھ کر آؤ۔ مدیر

ہے قدرت کے رنگوں سے معمور جھیل
یہ چلکا ہے اتکل کی مشہور جھیل
پرندوں کا آتا ہے جب بھی خیال
جھلکتا ہے چلکا کا حسن و جمال
علی الصبح پانی کی رِل رِل صدا
پرندوں کی چہکار، نازو ادا
پروں سے اڑاتے ہیں پانی کا رنگ
لگاتے ہیں غوطے بھی یہ سنگ سنگ
دھنک رنگ چھینٹیں اڑاتے ہیں سب
سرِ آب کرتب دکھاتے ہیں جب

وہ غوطے لگا کر ابھرتے ہیں جب
پروں کو پھلا کر سنورتے ہیں جب
یہ منظر نگاہوں میں کھب جاتا ہے
تصور میں فردوس در آتا ہے
دل وجاں کو دیتی ہے راحت یہ جھیل
ہے آبی پرندوں کی جنت یہ جھیل
مسافر پرندوں کی منزل ہے یہ
سکون اور چاہت کی محفل ہے یہ
یہاں کی فضا دل کو بھاتی ہے خوب
یہ چلکا نظارے دکھاتی ہے خوب

♦ خاور نقیب، پوسٹ آفس سنگرا، ضلع کٹک، اوڈیشا۔ 754221

□ ادارہ

اکتوبر واقعات کے آئینے میں

شمسی سال کا دسواں مہینہ اکتوبر، دراصل، جیسا ہم پہلے بھی لکھتے آئے ہیں، کبھی اس رومن کلینڈر کا آٹھواں مہینہ ہوا کرتا تھا جو حضرت عیسیٰ کی ولادت سے 46 سال پہلے رائج تھا۔ اطالوی زبان میں آکٹو Octo کا مطلب ہے آٹھ یا آٹھواں۔ سنسکرت میں اشٹم کا مطلب ہے آٹھواں اور اشٹم ہی غالباً یورپ پہنچتے پہنچتے اوشٹو یا آکٹو بنا ہوگا۔ اردو کا آٹھ بھی اشٹم سے ہی آیا ہے۔ بعد میں رومن کلینڈر کی جگہ جولین اور گریگورین کلینڈر رائج ہوا اور ان کلینڈروں میں یکم مارچ کی بجائے پہلی جنوری سے سال کی شروعات مانی گئی تو اکتوبر آٹھویں سے دسواں مہینہ بن گیا۔ سال بھر میں سات مہینے 31 دنوں کے ہوتے ہیں، اور اکتوبر ان ہی میں سے ایک ہے۔ زمینی گولے کے آدھے شمالی حصے میں یہ پت جھڑ یا Autumn کے موسم کا حصہ ہوتا ہے جب کہ باقی جنوبی حصے میں ان دنوں اپریل جیسا بہار یا بسنت کا موسم چل رہا ہوتا ہے۔

اب دیکھتے ہیں کہ اکتوبر میں کون سے اہم تاریخی واقعات ہوئے ہیں:

یکم اکتوبر: چین کی کمیونسٹ پارٹی کے چیئر مین ماؤ زے تنگ نے 1949 میں اس روز چین کو عوامی جمہوریہ چین یا پیپلز ری پبلک آف

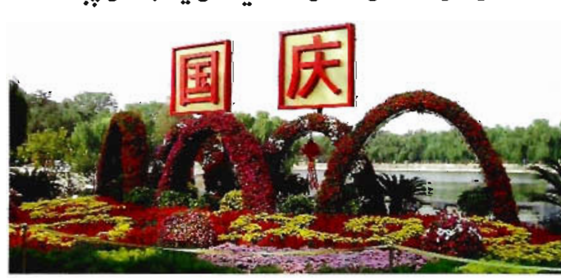

چائنا بنائے جانے کا اعلان کیا اور یہ وہاں کا قومی دن مانا جاتا ہے۔ 1979 میں امریکہ نے 70 سال کے قبضے کے بعد پناما نہر پنامہ کی حکومت کے حوالے کر دی جو دو بڑے سمندروں اٹلانٹک یعنی بحر اوقیانوس کو پیسفک یعنی بحرالکاہل سے ملاتی ہے۔

2 اکتوبر: 1869 کو مہاتما گاندھی پور بندر گجرات میں پیدا ہوئے۔

1904 میں سابق وزیر اعظم لال بہادر شاستری کی پیدائش ہوئی۔ گاندھی جی کی سمادھی راج گھاٹ پر 1986 میں ہندوستانی وزیر اعظم راجیو گاندھی پر درختوں میں چھپے ایک آتنک وادی نے گولیاں چلائیں مگر وہ بال بال بچ گئے۔ 1975 کو جاپان کے شہنشاہ ہیرو ہیتو پہلی بار امریکہ کے دورے پر وہائٹ ہاؤس پہنچے۔

13 اکتوبر: 1932 کو عراق برطانیہ کی غلامی سے آزاد ہوا اور لیگ آف نیشنز کا ممبر بن گیا جو بعد میں یو این او یعنی یونائٹڈ نیشنز آرگنائزیشن میں تبدیل ہوگئی اور اب اسے صرف یو این کہا جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ میں مشرقی اور مغربی جرمنی میں تقسیم ہو جانے والا جرمنی 45 سال بعد 1990 میں پھر ایک ہو کر فیڈرل ری پبلک آف جرمنی بن گیا۔

14 اکتوبر: کیتھولک عیسائیوں کے ملکوں میں اس روز 1582 میں پوپ گریگوری کا فرمان جاری ہوا کہ 4 اکتوبر سے جولین کلینڈر کی جگہ نیا گریگورین کلینڈر شروع ہوگا جس میں دس روز کے اس فرق کو دور کر دیا گیا تھا جو کہ جولین کلینڈر میں ڈیڑھ ہزار سال میں پیدا ہوا تھا۔ برطانیہ اور امریکہ نے 1752 سے اس کلینڈر کو اپنایا تو لوگوں نے بڑا احتجاج کیا کہ ان کی زندگی کے گیارہ دن کم ہو جائیں گے۔ 1957 میں اس روز روس نے انسان کا بنایا ہوا پہلا سیارہ 'اسپتنک' Sputnic خلا میں بھیجا جس سے دنیا میں خلائی تحقیق کے دور کا آغاز ہوا۔ یہ سیارہ یا

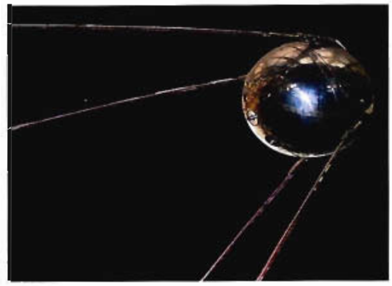

روسی سیارچہ اسپتنک کی ایک نقل جو امریکہ کے خلائی میوزیم میں رکھی ہے

سیارچہ صرف 184 پونڈ وزنی تھا اور یہ 21 روز تک ریڈیو سگنل 'بیپ' کی آواز میں بھیجتا رہا۔ اس واقعے نے روس اور سوویت یونین کے سب سے بڑے حریف امریکہ کے سیاسی حلقوں میں ہلچل مچادی اور دونوں میں خلائی دوڑ شروع ہوگئی جس کے نتیجے میں بارہ برس بعد انسان نے چاند پر قدم رکھے۔ 1965 میں اس روز پوپ پال ششم امریکہ جانے والے پہلے پوپ بن گئے جنھوں نے اقوام متحدہ UN سے بھی خطاب کیا۔ 1993 میں اس دن روسی صدر بورس یلتسن کے وفادار ٹنک بردار فوجیوں نے روسی پارلیمنٹ پر حملہ کرکے کٹّر پنتھی کمیونسٹوں کی بغاوت کو کچلنے کے ساتھ نائب صدر الیگزنڈر کو برطرف کرکے اپوزیشن لیڈروں کو جیل میں ڈال دیا۔

15 اکتوبر: 1908 کو بلغاریہ میں ترکی کی خلافت عثمانیہ کی غلامی سے آزاد ہوگیا۔ 1910 میں پرتگال میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا اور وہ شاہ مینوئل کے خلاف کامیاب بغاوت کے بعد جمہوری ملک بن گیا۔ خلائی عہد شروع کرنے والے سائنسداں رابرٹ گوڈارڈ 1882 میں اسی روز پیدا ہوئے۔ انھوں نے سیال ایندھن سے چلنے والا دنیا کا پہلا راکٹ بنایا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کو خلا میں لے جانے والی مشین بنائی جاسکتی۔ ان کے اس نظریے کا پہلے مذاق اڑایا گیا تھا لیکن بعد میں یہ درست ثابت ہوا۔

رابرٹ گوڈارڈ

16 اکتوبر: نیویارک میں 1927 میں دنیا کی پہلی بولتی فلم 'دی جاز سنگر' دکھائی گئی۔ یہ دنیا کی پہلی فیچر فلم تھی جس میں کرداروں کے بولنے کی بھی آواز سنائی دیتی تھی۔ مصر اور شام نے 1973 میں سوئیز نہر کے مشرقی کنارے اور گولان پہاڑیوں میں اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کردیا۔ 1981 میں اس دن مصر کے صدر انور سادات کو راجدھانی قاہرہ میں مسلم کٹّر پنتھی توپچی نے گولیوں سے اڑادیا جب وہ مصر کے قومی دن کی فوجی پریڈ میں شامل اس کی توپ کی سلامی لے رہے تھے۔

انور سادات کے قتل کا ہولناک منظر

17 اکتوبر: 1737 میں 40 فٹ اونچی سمندری لہروں نے 20 ہزار چھوٹے جہازوں اور کشتیوں کو ڈبو دیا جس سے بنگال اور ہندوستان میں 3 لاکھ لوگوں کی موت ہوگئی۔ جرمنی کی تقسیم کے بعد 1949 جرمن ڈیموکریٹ ری پبلک کے نام سے الگ ملک وجود میں آیا جس پر سوویت یونین کا غلبہ تھا مگر 41 برس بعد 1990 میں یہ پھر متحدہ جرمنی میں واپس آگیا۔ 1985 میں فلسطینی دہشت گردوں نے اٹلی کے ایک سمندری جہاز کو قبضے میں لے لیا جس پر 440 مسافر سوار تھے۔ انھوں نے اسرائیل کو دھمکی دی کہ اگر اس نے 50 فلسطینی قیدیوں کو رہا نہیں کیا تو وہ جہاز کو بموں سے اڑادیں گے۔

18 اکتوبر: 1871 میں اس روز شکاگو میں بھیانک آگ لگی۔ کہا جاتا ہے کہ ڈے کوون اسٹریٹ پر مسز اولیاری کی گائے نے کچھ ایسی دولتی جھاڑی کہ ایک جلتی ہوئی لالٹین اچھل کر مویشیوں کے چارے کے گودام پر جاگری جس سے وہ آگ بھڑکی کہ ساڑھے تین مربعہ میل علاقہ آگ کی لپیٹ میں آگیا، 300 لوگ مارے گئے، 90 ہزار بے گھر ہوگئے 17450 مکان تباہ ہوگئے اور 20 کروڑ ڈالر کا سامان جل کر راکھ ہوگیا۔ 1996 میں فلسطینی رہنما یاسر عرفات نے اسرائیلی وزیراعظم سے ان کی رہائش گاہ پر بات چیت کرنے کے لیے پہلی بار اسرائیل کا دورہ کیا۔

9 اکتوبر: 1962 میں یوگنڈا نے 70 سال برطانیہ کا غلام رہنے کے بعد آزادی حاصل کی۔ 1940 میں لیور پول انگلینڈ میں بیٹلز گروپ کے

جان لینن

فنکار جان لینن کی پیدائش ہوئی۔ نیویارک سٹی امریکہ میں 8 دسمبر 1980 کو ان کا قتل کر دیا گیا۔

10 اکتوبر: 1962 کو ہندوستانی فوجیوں نے در انداز چینیوں کے ٹھکانوں پر حملہ کیا۔

11 اکتوبر: 1737 کو زبردست زلزلے نے 3 لاکھ لوگوں کی جانیں لے لیں اور آدھا کلکتہ پوری طرح تباہ ہو گیا۔ 1939 میں مشہور سائنس داں البرٹ آئنسٹائین نے امریکی صدر فرینکلن روزویلٹ کو خبردار کیا کہ جرمنی ان کی سائنسی تھیوریوں کی مدد سے ایٹم بم بنا سکتا ہے اس لیے اچھا ہوگا کہ امریکہ خود اپنا ایٹم بم بنالے۔ امریکہ نے ایسا ہی کیا۔

12 اکتوبر: 1946 کو کرکٹر وینو منکڈ کے بیٹے اشوک منکڈ کا جنم ہوا جنھوں نے 1969 سے 1978 تک ہندوستان کے لیے بیٹنگ کی۔

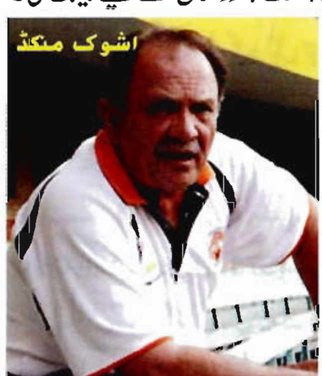
اشوک منکڈ

1492 میں 33 دن کے سمندری سفر کے بعد کرسٹوفر کولمبس اور اس کے مایوس ملاّحوں کو بالآخر زمین دکھائی دی اور وہ بہاماز Bahamas کے جزیرے پر اترے۔ کولمبس نے اس کا

کولمبس اور اسکے ملاح بہاماز میں جسے وہ ہندوستان سمجھ بیٹھا تھا

نام اسپین کے بادشاہ کے نام پر ال سلواڈور رکھا۔ وہ یوروپ سے مغرب کی جانب سے ہندوستان تک پہنچنے کا سمندری راستہ ڈھونڈنے نکلا تھا۔ چنانچہ اس جزیرے پر رہنے والوں کو وہ ہندوستانی سمجھا اور تانبے کی رنگت والے ان لوگوں کی نسل آج تک امریکہ میں ریڈ انڈین کہلا رہی ہے اور اس طرف جزیرے آج تک اسی طرح ویسٹ انڈیز West Indies کہلا رہے ہیں جس طرح ملائیشیا، انڈونیشیا وغیرہ کو ہندوستان کے مشرق میں واقع ہونے کی وجہ سے ایسٹ انڈیز East Indies کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد کولمبس نے اس طرف تین مرتبہ اور سفر کئے لیکن براعظم امریکہ کو پار نہیں کر پایا۔ 1811 میں پیراگوئے نے اسپین اور ارجنٹائنا کی غلامی سے آزادی کا اعلان کیا۔ 1822 میں برازیل بھی پرتگال کی غلامی سے آزاد ہو گیا۔ 1960 میں اقوام متحدہ UN میں ملکوں کو غلام بنائے جانے کے نظام (نو آبادیاتی نظام) پر ہونے والی بحث میں بولتے ہوئے سوویت یونین کے رہنما نکیتا خروشچیف نے اپنے پاؤں سے جوتا نکالا اور اسے کئی بار ڈیسک پر زور سے مارا۔

13 اکتوبر: سن 54 کو روم کے بادشاہ کلاڈئیس کھمبی Mushroom سے بنا ہوا وہ کھانا کھا کر مر گیا جس میں اس کی بیوی ملکہ اگریپینا نے زہر ملا دیا تھا۔ 1884 میں گرین وچ Greewich کے وقت کو پوری دنیا کے لیے یونیورسل ٹائم قرار دیا گیا جس کی بنیاد پر باقی ملکوں کا معیاری وقت طے ہوتا ہے۔ اٹلی نے 1943 میں اپنے ڈکٹیٹر مسولینی کی فاشسٹ سرکار کے زوال کے بعد، دوسری عالمی جنگ میں اپنے ساتھی ملک جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

14 اکتوبر: ہندوستان کے تیسرے مغل بادشاہ، اکبراعظم (ابوالفتح جلال الدین محمد اکبر) کی 1556 میں پیدائش ہوئی۔ مغل بادشاہ بہادرشاہ اوّل 1643 میں پیدا ہوا۔ 1912 سابق امریکی صدر ٹیڈی روز ویلٹ کو چناؤ جلسے میں ایک کٹر پنتھی نے گولی ماردی مگر ایک موٹا اوور کوٹ پہنے ہونے کی وجہ سے اور سامنے کی جیب میں چشمے کے کیس اور تقریر کے بہت سے مڑے ہوئے کاغذوں کی موجودگی نے گولی کے زور کو کم کردیا اور گولی کے جسم میں داخل ہونے کے باوجود بے پناہ قوت برداشت کی وجہ سے وہ سنبھلے رہے اور انھوں نے اپنی تقریر اور جلسے کے ختم ہونے سے پہلے اسپتال جانے سے انکار کردیا۔ بعد میں وہ اسپتال گئے اور دو ہفتوں میں ٹھیک ہو گئے۔ امریکہ کے کالے لوگوں کے عظیم رہنما مارٹن لوتھر کنگ کو 1964 میں امن کا نوبل انعام دیا گیا جس کی 54 ہزار ڈالر کی رقم انھوں نے شہریوں کے حقوق کی لڑائی لڑنے والی تنظیم کو خیرات کردی۔

روزویلٹ گولی لگنے کے باوجود تقریر کے دوران خون آلود کاغذات دکھاتے ہوئے

15 اکتوبر: شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کا 1605 میں 63 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ہندوستان کے گیارہویں صدر جمہوریہ آول پاکر زین العابدین عبدالکلام 1931 میں پیدا ہوئے۔ 1932 میں ٹاٹا ائر لائنز کا پہلا ہوائی جہاز مسافروں کو لے کر اڑا۔ بعد میں یہ ائر انڈیا کے نام سے ہندوستانی حکومت کی ملکیت بن گئی۔ مشہور فلم اداکار وکٹر بنرجی 1946 میں کلکتہ میں پیدا ہوئے۔ پہلی عالمی جنگ کی مشہور زمانہ جاسوس ماتا ہری کو 1917 میں فرانسیسی فائرنگ دستے نے پیرس کے باہر وسینیز کی بیرک میں موت کی سزا دے دی۔ ہٹلر کے ساتھی اور جرمنی کے وزیر ہرمن گوئرنگ نے جنگی جرائم کے لیے 1946 میں سزائے موت دیے جانے سے چند گھنٹے پہلے نیورمبرگ کی جیل میں زہر کھا کر خودکشی کر لی۔ ہٹلر ایک سال پہلے ہی 'خودکشی' کر چکا تھا۔ 1964 میں نکیتا خروشچیف کو سوویت یونین کی کمیونسٹ پارٹی کے پہلے سکریٹری کے عہدے سے ہٹا دیا گیا اور لیونِد بریژنیف اس عہدے پر فائز ہوئے۔ 1844 میں مشہور جرمن فلسفی فریڈرک نیتشے Friedrich Nietzsche کی پیدائش ہوئی جس نے انیسویں صدی کے آخر میں پیشین گوئی کی تھی کہ دنیا میں اب ایسی جنگیں ہوں گی جیسی پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ یہ پیشین گوئی درست نکلی۔

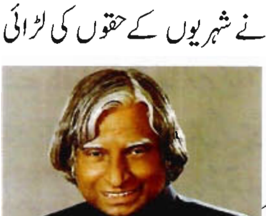

سابق صدر عبدالکلام

ٹاٹا ائر لائنز کی پہلی پرواز کے بروشر کا سرورق

16 اکتوبر: 1905 کو بنگال تقسیم ہو گیا۔ خلیج بنگال میں 1942 میں سائیکلونی طوفان نے جنوبی کلکتہ میں تباہی مچائی اور 40 ہزار لوگوں کی جانیں لے لیں۔ 1952 میں نئی دہلی میں پاکستان کے ساتھ ہندوستان کا پہلا ٹیسٹ میچ شروع ہوا جس میں وینو منکڈ نے 13 پاکستانی وکٹ لے کر ہندوستان کو جیت دلا دی۔ 1978 میں کپل دیو نے فیصل آباد پاکستان میں ٹیسٹ کرکٹ کی شروعات کی۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد

کپل دیو

افراتفری کے دنوں میں بادشاہ لوئی سولہویں کی بے حد فضول خرچ اور نک چڑھی بیوی ملکہ میری انٹوئنیٹ کا 1793 میں سر قلم کردیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہی وہ عورت تھی جس نے محل کے باہر بھوکے لوگوں کی بھیڑ کے بارے میں یہ معلوم ہونے پر کہ ان کے پاس کھانے کو روٹی نہیں، کہا تھا کہ ''روٹی نہیں ہے تو انھیں کیک کھانا چاہیے۔'' 1853 میں ترکی کی خلافت عثمانیہ نے روس، برطانیہ، فرانس اور اٹلی کے خلاف جنگ چھیڑ دی جو تاریخ میں کریمیا وار Crimean War کہلائی۔ یہ پہلی جنگ تھی جس کی خبریں اخبارات اور تصویروں کے ذریعے لوگوں تک پہنچیں۔ جنگ کے دوران گندگی کے ماحول میں پنپنے والی بیماریوں نے قہر برپا کردیا۔ یہی وہ جنگ تھی جس میں برطانیہ کی فلورنس نائٹنگیل نے جسے لوگ راتوں میں چراغ لے کر مریضوں کے خیموں آتے جاتے دیکھے جانے پر لیڈی ود دی لیمپ Lady with the lamp بھی کہتے تھے، مریضوں کے علاج کی جگہوں اور عام مقامات کو صاف ستھرا رکھنے کے نئے ضابطے بنانے کی شروعات کی۔ چین نے 1965 میں لوپ نور میں اپنے پہلے ایٹم بم کا تجربہ کیا۔ 1758 میں امریکہ میں نوآ ویبسٹر Noah Webster کی پیدائش ہوئی جنھوں نے امریکہ میں انگریزی کی پہلی ڈکشنری تیار کی۔ 1854 میں ڈبلن آئرلینڈ میں آئرش شاعر اور ڈرامہ نویس آسکر وائلڈ پیدا ہوئے۔

میری اینٹوئنیٹ

مدر ٹریسا

فلورنس نائٹنگیل

آسکر وائلڈ

17 اکتوبر: مدر ٹریسا کو 1979 میں نوبل امن انعام دیا گیا۔

18 اکتوبر: ہندوستان کے لیے 55 ٹیسٹ میچ کھیلنے والے وجے منجریکر کا 1983 میں انتقال ہوگیا۔

19 اکتوبر: 1948، 1952 اور 1956 میں اولمپک ہاکی میں گولڈ میڈل جیتنے والی ٹیم کے ممبر بلبیر سنگھ 1929 میں پیدا ہوئے۔ 1983 کا نوبل انعام حاصل کرنے والے آسٹروفزکس کے ہندوستانی سائنس داں سبرامنین چندر شیکھر کی 1910 میں پیدائش ہوئی۔ آسٹریلیا کے ایلن بارڈر نے 1986 میں اپنا دس ہزارواں ٹیسٹ رن ممبئی میں ہندوستان کے خلاف بنایا۔ 1781 میں امریکہ کے یارک ٹاؤن میں برطانوی جنرل لارڈ کارن والیس اور ان کے 7000 فوجیوں نے امریکی جنرل جارج واشنگٹن کے سامنے ہتھیار ڈال کر خود کو امریکیوں کے حوالے کردیا۔ اس طرح برطانیہ اور امریکہ میں اپنی کالونیوں کے لیے جنگ بند ہوگئی۔

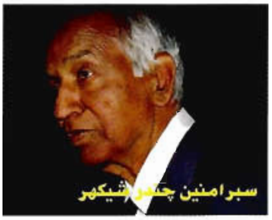

سبرامنین چندر شیکھر

20 اکتوبر: چینی فوجیں 1962 میں ہندوستان میں داخل ہوگئیں۔ اتر کاشی میں زلزلے سے 1991 میں 670 لوگ جاں بحق ہوگئے۔

22 اکتوبر: ہندوستان نے اپنی پہلی خلائی چاندمہم کے جہاز 'چندریان۔1' کو 2008 میں چاند پر بھیجا۔ مشہور پیانو نواز میوزک کمپوزر فرانز لسٹ Franz Liszt ہنگری میں 1811 میں پیدا ہوئے۔ Hungarian Rhapsody No. 2,

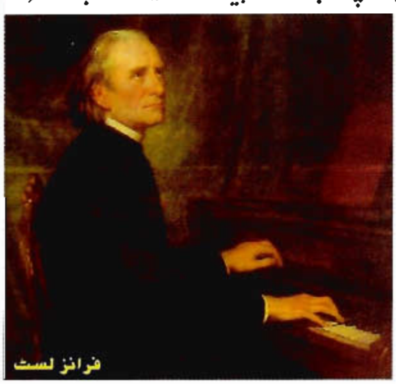

فرانز لسٹ

Liebestraum No. 3 اورFaust،Dante ان کی یادگار سمفنیاں ہیں جو آج بھی مشہور ہیں۔

23 اکتوبر: 1959 کو چینی فوجیوں نے ہندوستانی علاقے میں گھس کر ہمارے 17 سپاہیوں کو مار ڈالا۔

24 اکتوبر: 1945 میں یونائٹڈ نیشنز UN قائم ہوئی۔

25 اکتوبر: 1881 میں ملاگا، اسپین میں مشہور آرٹسٹ پابلو پکاسو پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف پینٹنگ میں بلکہ سنگ تراشی، کندہ کاری Engraving اور سیرامک Ceramic پر تصویر کشی میں بھی دنیا بھر میں نام کمایا۔

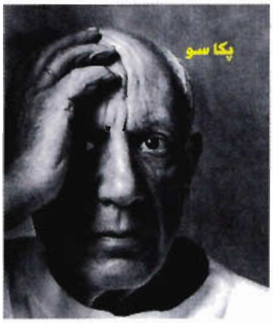

26 اکتوبر: 1947 کو جموں کشمیر کے مہاراجہ ہری سنگھ نے ہندوستان کے ساتھ الحاق کر لیا۔ 1947 میں اسی روز ہلیری کلنٹن پیدا ہوئیں جو اپنے شوہر بل کلنٹن کے امریکی صدر منتخب ہونے کی بنا پر 1993 سے 2001 تک امریکہ کی فرسٹ لیڈی رہیں۔ وہ امریکہ کی پہلی فرسٹ لیڈی ہیں جو امریکی سینیٹ کے لیے منتخب ہوئیں اور اس وقت امریکہ کی وزیر خارجہ ہیں۔

27 اکتوبر: 1920 کو کے آر نرائنن کا جنم ہوا جو ہندوستان کے دسویں صدر جمہوریہ چنے گئے۔ برطانوی جہاز راں جیمس کک 1728 میں پیدا ہوا اور اس نے دنیا کے جنوب میں سمندری سفر کرتے ہوئے نیوزی لینڈ، آسٹریلیا اور ہوائی جزیروں کا پتہ لگایا۔

28 اکتوبر: 1627 کو مغل بادشاہ جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔ 1919 میں امریکہ میں شراب پر پابندی لگا دی گئی جو 14 برس جاری رہی لیکن اس نے مجرم گروہ پیدا کر دیے اور شراب کی غیر قانونی فروخت امریکہ کا سب سے زیادہ منافع بخش کاروبار بن گئی تھی۔ 1955 میں واشنگٹن میں بل گیٹس کی پیدائش ہوئی

جہانگیر

جن کی کمپنی مائکروسوفٹ دنیا میں سب سے بڑی سافٹ ویئر کمپنی بن گئی۔

29 اکتوبر: 1999 میں اڑیسہ میں ٹراپیکل سائیکلون آیا جس میں پندرہ ہزار سے زیادہ لوگوں کی جانیں گئیں۔ 1618 میں مشہور مصنف، شاعر، سپاہی، درباری معزز انگریز سر والٹر ریلے Walter Raleigh کو شاہ جیمس اول کے حکم پر غدّاری کے الزام میں لندن میں سزائے موت دے دی گئی۔ انگلینڈ میں تمباکو نوشی کو رواج دینے والے سر والٹر ریلے نے برّ اعظم امریکہ کے دور دراز سفر کئے تھے اور ٹاور آف لندن میں قید رہ کر عالمی تاریخ بھی لکھی۔ 1897 میں پال جوزف گوئبلز جرمنی میں پیدا ہوا جو بعد میں ہٹلر کا پراپیگنڈہ ماسٹر بنا۔ ہٹلر کے محفوظ تہہ خانے میں اس نے اپنے چھ بچّوں کے ساتھ زہر کھا کر خودکشی کی۔

30 اکتوبر: برفانی عہد Ice age کے بعد پہلی مرتبہ انگلینڈ انگلش چینل میں سمندر کے نیچے بنائی گئی ریلوے لائن کے ذریعے باقی یوروپ سے جڑ گیا۔ برطانیہ کو فرانس سے ملانے والی اس لائن کی شروعات 1990 میں ہوئی۔

31 اکتوبر: ہندوستان کی مایہ ناز شخصیت اور وزیر اعظم محترمہ اندرا گاندھی کو 1984 میں ان ہی کے باڈی گارڈز نے نئی دہلی میں ان کی

رہائش گاہ پر بے رحمی سے قتل کر دیا۔ اس شہادت کے بعد اسی شام راجیو گاندھی کو وزیر اعظم بنایا گیا۔ 1876 میں ایک زبردست سائیکلون نے ہندوستان میں تباہی مچا دی جس سے 2 لاکھ لوگ ہلاک ہو گئے۔ □

ثمینہ پروین

نانی کے صندوق سے ایک دل چسپ کہانی

یہ دنیا گول ہے

مدت گزری کسی ملک پر ایک بے وقوف بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ ایک دن وہ محل میں بیٹھا جغرافیے کی کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک صفحے پر گڑ گئی۔ لکھا تھا: 'زمین گیند کی طرح گول ہے۔ اگر ہم بالکل سیدھے ایک ہی سمت میں سفر کرتے جائیں تو واپس اسی جگہ پر پہنچ جائیں گے جہاں سے چلے تھے۔'

یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے کتاب ایک طرف رکھ دی اور غصے سے چیخا ''وزیر!... یہ میں کیا پڑھ رہا ہوں؟'' بادشاہ نے خوب تن کر کہا، ''یہ جھوٹ ہے... بھلا ایسا کبھی ہوسکتا ہے کہ زمین گول ہو!؟''

''حضور کا اقبال بلند ہو۔ زمین واقعی گول ہے۔'' وزیر نے ادب سے کہا۔

یہ سن کر بادشاہ کے غصے کا پارہ اور بھی چڑھ گیا۔ تلملا کر بولا۔ ''خاموش... کیا تم نے مجھے بدھو سمجھ رکھا ہے؟ زمین چپٹی ہے۔ بالکل چپٹی۔ جیسے تمھارا گنجا سر۔''

''میرے آقا! جغرافیے کے کئی عالم یہ بات ثابت کر چکے ہیں کہ زمین گول ہے۔'' وزیر نے آہستہ سے کہا۔

''چپ رہو!'' بادشاہ گرجا۔ ''میرے ابا اور دادا جان مرحوم بہت بڑے جہاز ران اور جغرافیہ دان تھے۔ انھوں نے تو کبھی یہ نہ کہا کہ زمین گول ہے۔ تم کتاب کے مصنف کو فوراً حاضر کرو۔ ہم اس سے اس بات کا ثبوت طلب کریں گے۔''

کتاب کا مصنف ایک نہیں پورے سات جغرافیہ دان تھے۔ وزیر نے تھوڑی دیر میں ان سب کو بادشاہ کے حضور میں حاضر کر دیا۔

بادشاہ نے ان سے کہا، ''تم اس ملک کے رہنے والے ہو جس کا بادشاہ نام ور جغرافیہ دانوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ تم نے ہم سے پوچھے بنا کتاب میں یہ کیسے لکھ دیا کہ زمین گول ہے! ہم کہتے ہیں زمین چپٹی ہے۔''

''حضور، جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں؟'' ایک عالم بولا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ سورج چاند ستارے اور سیارے گول ہیں۔ ہماری زمین بھی چونکہ ایک سیارہ ہے، اس لیے یہ گول ہی ہوگی۔ اس کے علاوہ زمین کے گول ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص ناک کی سیدھ میں ایک ہی طرف چلتا جائے تو وہ واپس اسی جگہ پہنچ جائے گا جہاں سے چلا تھا۔''

''اچھا! یہ بات ہے تو ہم خود دنیا کے گرد سفر کر کے دیکھتے ہیں۔'' بادشاہ نے کہا۔ ''اگر زمین گول نہ ہوئی تو تم سب کی گردن مار دی

جائے گی۔ وزیر! سفر کی تیاری کرو۔''

اس وقت شام کے چھ بجے تھے۔ حکم کی دیر تھی کہ باہر ایک لمبا چوڑا قافلہ تیار ہوگیا۔ اس زمانے میں نہ موٹریں تھیں نہ ہوائی جہاز۔ لوگ گھوڑوں اور اونٹوں پر سفر کرتے اور گھنٹوں کا سفر مہینوں میں طے ہوا کرتا تھا۔ اب قافلہ تو تیار ہوگیا لیکن الجھن یہ آن پڑی کہ کس طرف

بادشاہ نے کہا زمین گول ہو ہی نہیں سکتی، یہ جھوٹ ہے

کو جایا جائے؟ ''حضور، میرے خیال میں جنوب میں چلنا چاہیے۔'' وزیر نے عرض کی۔

''جنوب کی طرف؟'' بادشاہ نے اچھل کر کہا۔ ''یعنی ہم اپنے دشمن کے ملک میں گھس جائیں! تمھاری عقل کو چڑیاں تو نہیں چگ گئیں؟''

''حضور غلطی معاف۔ آپ ہی کچھ ارشاد کریں۔'' وزیر نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا۔

''اوں...ہوں...'' بادشاہ سوچنے لگا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے کہا، ''جنوب کی طرف دشمن کا ملک ہے۔ مشرق کی طرف جانا بھی خطرے سے خالی نہیں کیونکہ اس طرف سے سورج نکلتا ہے۔ ہوسکتا ہے ہم بے خبری میں اس کے قریب پہنچ جائیں اور جل کر بھسم ہو جائیں۔ مغرب کی طرف سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے اس کو کیسے پار کریں گے؟... جاؤ قافلے کو حکم دو کہ وہ سیدھا شمال کی طرف چلے۔''

بگل بجانے والوں نے بگل بجایا اور شاہی قافلہ بڑی شان سے دنیا کے گرد چکّر لگانے کے لیے روانہ ہوگیا۔ چلتے چلتے تین گھنٹے گزر گئے۔ بادشاہ سلامت کو نشے کی لت تھی۔ تھوڑی سی افیم کھائی تو غین ہوگئے۔

وزیر تاک میں بیٹھا تھا۔ جھٹ اونٹ سے اتر پڑا اور قافلے کا رخ واپس شہر کی طرف موڑ دیا۔ تین گھنٹے بعد یہ قافلہ شہر کے بڑے دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کے پاس ہی ایک اونچا سا مینار تھا۔ اسی درمیان بادشاہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ دروازہ اور مینار دیکھ کر چونکا۔ وزیر سے پوچھا۔ ''یہ ہم کہاں آ گئے ہیں؟''

وزیر نے کہا۔ ''حضور یہ تو اپنے ہی شہر کا دروازہ ہے۔ اسے پہچانیے۔''

''نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں یہ نہیں مان سکتا۔'' بادشاہ نے کہا۔

''حضور میں تیس سال سے آپ کا نمک کھا رہا ہوں۔ بھلا آپ سے جھوٹ بول سکتا ہوں۔'' وزیر نے جھک کر کہا۔ ''ہم چھ بجے یہاں سے روانہ ہوئے تھے اور چھ گھنٹے میں دنیا کا چکّر لگا کر وہیں واپس آ گئے ہیں۔''

''جہاں سے چلے تھے وہیں واپس آئے ہیں نا!'' بادشاہ نے سٹپٹا کر پوچھا۔

''جی ہاں عالی جاہ!'' وزیر بولا۔ ''وہ دیکھیے، دروازے کے اس

وزیر نے بادشاہ کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ زمین گول ہے

طرف سامنے ہی آپ کا شاہی محل ہے۔''

''بہت خوب، بہت خوب!'' بادشاہ خوش ہو کر بولا۔ ''تب تو وہ کتاب لکھنے والے سچے ہیں۔ انھیں چھوڑ دو اور بہت سا انعام و اکرام بھی دو۔''

تو بھئی، یوں ایک دانا وزیر کی عقل مندی نے نہ صرف سات آدمیوں کی جان بچائی، بلکہ پورے قافلے کو بھی تباہی سے بچالیا۔ □

بشکریہ: اردو پوائنٹ

نانی کے صندوق سے

شیلندر

نانی تیری مورنی کو مور لے گئے

نانی تیری مورنی کو مور لے گئے
باقی جو بچا تھا کالے چور لے گئے

کھاکے پی کے موٹے ہو کے چور بیٹھے ریل میں
چوروں والا ڈبہ کٹ کے پہنچا سیدھا جیل میں

ان چوروں کی خوب خبر لی موٹے تھانیدار نے
موروں کو بھی خوب نچایا جنگل کی سرکار نے
نانی تیری مورنی کو مور لے گئے
باقی جو بچا تھا کالے چور لے گئے

اچھی نانی پیاری نانی روسا روسی چھوڑ دے
جلدی سے اک پیسہ دے دے تو کنجوسی چھوڑ دے
نانی تیری مورنی کو مور لے گئے
باقی جو بچا تھا کالے چور لے گئے

قسط وار ناول

☐ جولز ورنے • مترجم: صفدر حسین

اَسّی دِن کا سفر

5

فرانسیسی مصنف، شاعر اور ڈرامہ نویس جولز گیبرئیل ورنے Jules Gabriel Verne دنیا میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ناول نگاروں میں شامل ہیں۔ جاسوسی ناول نگار اگاتھا کرسٹی کے بعد جولز ورنے دنیا کے دوسرے مصنف ہیں جن کی کتابوں کا سب سے زیادہ زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ ان کے ناولوں پر فلمیں بن چکی ہیں جن میں اراؤنڈ دی ورلڈ ان ایٹی ڈیز Around the World in Eighty Day بہت مشہور ہوئی۔ یہ ایک ایسے شریف انسان فلیس فوگ Phileas Fogg کی مہم جوئی کا قصہ ہے جو لندن کے ایک کلب میں تقریباً ڈیڑھ سو سال پہلے کے ایک ایسے زمانے میں صرف اسّی دن کے اندر دنیا کا پورا ایک چکّر لگانے کی شرط قبول کر لیتا ہے جب ہوائی جہاز اور موٹریں نہیں تھیں اور پانی کے جہاز بھاپ سے چلتے تھے۔ جیسے ہی فلیس فوگ اپنے فرانسیسی خادم ژاں پاسپرٹو Jean Passepartout کو ساتھ لے کر شرط کے مطابق اپنا سفر شروع کرتا ہے پولیس اسے ڈاکو سمجھ کر پیچھے لگ جاتی ہے اور یوں طرح طرح کی رکاوٹوں سے بھرا اس کا سفر بالآخر مکمل ہوتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ وقت کے معاملے میں پہلی مرتبہ فلیس فوگ سے ایک غلطی ہوگئی ہے اور وہ بظاہر شرط ہار جاتا ہے۔ لیکن تبھی ایک حیرت انگیز سچّائی سامنے آتی ہے جسے جان کر آپ حیران رہ جائیں گے کہ ارے! یہ تو ہم نے سوچا ہی نہیں تھا! مدیر

اب تک کی کہانی: یہ کہانی 1872 کی ہے۔لندن میں ایک مالدار شخص فلیس فوگ رہتا تھا۔لوگ بس اتنا جانتے تھے کہ وہ وقت، ضابطوں اور قول کا سخت پابند شریف آدمی ہے جو ایک بڑے گھر میں تنہا رہتا تھا جہاں اس کے اکیلے ملازم کو سارے کام مشین کی طرح قاعدے سے کرنے پڑتے تھے۔ 2 اکتوبر کو بے چارے نوکر کی شامت آئی تو اس نے مالک کو شیو کے لیے 86 ڈگری کی بجائے 84 ڈگری کا گرم پانی لا کر دے دیا۔فوگ نے اسے نکال کر ایک فرانسیسی شخص ژاں پاسپرٹو کو ملازم رکھ لیا جو ایماندار اور وقت کا پابند تھا۔ اسی روز فوگ اپنے 'ریفارم کلب' پہنچا تو اس کے دوست تین روز پہلے 29 ستمبر کو بنک آف انگلینڈ میں پڑی ڈکیتی کے بارے میں بات کرنے لگے، جس میں ڈاکو 55 ہزار پونڈ کے نوٹ لے اڑا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکو نہ جانے کہاں ہوگا اور اتنی بڑی دنیا میں اسے ڈھونڈ پانا اب ممکن نہیں۔ مگر فوگ کا کہنا تھا کہ انسان کی رفتار نے دنیا کو مختصر کر دیا ہے اور چور کو پکڑا جا سکتا ہے۔اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اسّی روز میں پوری دنیا کا چکّر لگا سکتا ہے۔اس کے دوست اسٹیوارٹ نے کہا وہ اس پر چار ہزار پونڈ کی شرط لگانے کو تیار ہے۔دوسرے لوگ بھی شرط میں مل گئے۔فوگ نے 20 ہزار پونڈ کی شرط

قبول کرلی۔ شرط کے مطابق فوگ کو اسی روز 2 اکتوبر بدھ کو سفر پر روانہ ہونا تھا جس کے بعد 21 دسمبر سنیچر کی رات 8 بج کر 45 منٹ تک واپسی پر وہ شرط جیت سکتا تھا۔ فوگ اسی رات اپنے خادم پاسپرٹو کو ساتھ لے کر دنیا کے سفر پر نکل پڑا۔ ادھر لندن میں اس سفر کی دھوم مچ گئی۔ اخباروں فوگ کی تصویریں بھی چھپی۔ شرط پر عام بحث ہونے لگی۔ کچھ لوگ فوگ کے حامی تھے تو کئی خلاف۔ 9 اکتوبر کو خفیہ پولیس کے جاسوس فکس کا سوئیز شہر سے آیا ہوا ایک ٹیلی گرام اخباروں میں چھپا تو کھلبلی مچ گئی کیونکہ اس میں بنک ڈکیتی کے شبہ میں فوگ کو گرفتار کرنے کی اجازت مانگی گئی تھی۔ ادھر سوئیز بندرگاہ پر فکس نے پاسپرٹو کو دوست بنا کر فوگ کی جاسوسی شروع کردی، جو بروقت اپنے سفر پر آگے چل پڑا:

ہندوستان کی سرزمین

سوئز سے عدن تک 1310 میل کا سفر جہاز کے ذریعہ 38 گھنٹوں میں طے ہوتا تھا۔ منگولیا، جہاز کے اکثر مسافر ہندوستان جارہے تھے۔ ان میں سے کچھ بمبئی پر اتر کر ریل کے ذریعہ کلکتہ جانے والے تھے۔ سوئیز سے روانگی کے دوسرے ہی دن پاسپرٹو کی نظر اتفاقاً فکس پر پڑی۔ پاسپرٹو فوراً لپک کر اس کے قریب گیا اور پوچھنے لگا:

''معاف کرنا! اگر میں نے پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی ہے تو تم وہی شخص ہو جس نے مجھے سوئز میں بازار کا راستہ بتلایا تھا۔''

''ہاں بے شک، میں بھی تمہیں پہچان گیا۔ تم اس سنکی انگریز کے ملازم ہونا؟''

''ہاں تمہیں جہاز پر دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہاں جارہے ہو؟''

''کیوں؟ میں بھی تمہارے ساتھ بمبئی جارہا ہوں۔''

''پھر تو خوب گزرے گی۔ کیا وہ ہندوستان کی راجدھانی ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ تم اس سے پہلے بھی بمبئی جاچکے ہو؟''

''ہاں کئی مرتبہ۔''

''کیا ہندوستان واقعی ایک دلچسپ ملک ہے؟'' پاسپرٹو نے پوچھا۔

''ہاں بہت دلچسپ جگہ ہے۔ وہاں بہت ساری چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں... مندر، مسجد... سادھو، فقیر، شیر، سانپ اور ہاتھی! میں سمجھتا ہوں تم وہاں کچھ دن ضرور ٹھہرو گے۔''

''ہاں! امید تو یہی ہے۔ یہ تو سراسر بے وقوفی ہوگی کہ کوئی شخص اپنی ساری زندگی ٹرین اور جہاز ہی میں گزار دے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ اسّی دن میں اسے دنیا کا سفر کرنا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارا یہ خبط بمبئی جا کر ختم ہوجائے گا۔''

''تمہارے مالک کا مزاج تو ٹھیک ہے؟ میں نے تو انھیں کبھی جہاز کے ڈیک پر بھی نہیں دیکھا۔'' فکس نے پوچھا۔

''ہاں، اچھے خاصے ہیں، لیکن وہ دوسروں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے، انھیں کوئی نئی جگہ یا نئی چیز دیکھنے کا شوق ہی نہیں۔''

آخر فکس سے نہ رہا گیا تو اس نے کہا:

''میں سمجھتا ہوں کہ اسّی دن میں دنیا کا سفر تو ایک بہانہ ہے اصل مقصد تو کچھ اور ہوگا۔ مجھے تو یہ ایک راز معلوم ہوتا ہے۔''

پاسپرٹو نے تنگ آکر کہا: ''یقین جانو مجھے کچھ نہیں معلوم اور نہ ہی میں کچھ جاننا چاہتا ہوں۔''

آخر 14 اکتوبر کو شام جہاز عدن پہنچا۔ 'منگولیا' کو بمبئی پہنچنے کے لئے ابھی اور 1650 میل کا سفر طے کرنا تھا اور اس لمبے سفر کے لئے عدن سے کافی مقدار میں کوئلہ لینا تھا۔ 'منگولیا' جہاز 15 اکتوبر کی صبح کی بجائے 14 اکتوبر کی شام ہی میں عدن پہنچ گیا جس کی وجہ سے فلیس فوگ کو اور 15 گھنٹے مل گئے۔ وہ اپنے پاسپورٹ پر ویزا کی مہر لگوانے کے لئے نیچے گیا۔ فکس بھی چوری چور اس کے پیچھے گیا۔ کچھ دیر بعد دونوں واپس آگئے۔ چھ بجے 'منگولیا' روانہ ہوگیا۔ اب 168 گھنٹوں میں اسے بمبئی پہنچنا تھا۔ سمندر پُر سکون تھا۔ ہوائیں بھی موافق تھیں۔ 20 اکتوبر کو اتوار کے دن دوپہر کے وقت ہندوستانی ساحل نظر آنے لگا اور ساڑھے چار بجے جہاز بمبئی کی بندرگاہ پر آلگا۔

اس وقت فلیس فوگ جہاز پر تاش کی 33 ویں بازی ختم کررہا تھا۔ اتفاق سے جہاز کے سفر میں بھی اسے تاش کھیلنے والے ساتھی مل گئے تھے۔ 'منگولیا' جہاز مقررہ وقت سے دو دن پہلے ہی یعنی 22 اکتوبر کی بجائے 20 اکتوبر کو بمبئی پہنچ گیا تھا۔ فلیس فوگ کو اور دو دن زائد مل گئے۔

بمبئی سے کلکتہ جانے والی ٹرین رات میں آٹھ بجے چھوٹتی تھی۔

اگر کوئی پرندہ اڑتے ہوئے بمبئی سے سیدھا کلکتہ جائے تو اسے مشکل سے گیارہ سو میل کا فاصلہ طے کرنا پڑے گا۔لیکن ریل ایک ہی سیدھ میں تو چلتی نہیں۔ وہ شمال میں الہ آباد سے ہوکر کلکتہ آتی تھی، جس کی وجہ سے ایک تہائی فاصلہ اور بڑھ گیا تھا۔ ان دنوں ریل بمبئی سے چل کر مغربی گھاٹ سے ہوتی ہوئی برہان پور جاتی تھی اور پھر دریائے گنگا کو پار کرکے بنارس اور چندر نگر سے ہوتی ہوئی تین دن میں کلکتہ پہنچتی تھی۔

فلیس فوگ نے پاسپرٹو کو کچھ سامان خریدنے کے لئے یہ جتلا کر بمبئی کے بازار بھیجا کہ وہ آٹھ بجے سے پہلے اسٹیشن آجائے، اور خود بمبئی شہر کی تمام دلچسپیوں کی طرف سے آنکھیں پھیر کر سیدھے پاسپورٹ کے دفتر گیا۔ اس نے راستے میں نہ ٹاؤن ہال دیکھا نہ عجائب گھر اور نہ کوئی مسجد، مندر یا گرجا گھر۔ وہ ان سب جگہوں سے ایسے گزر گیا گویا راستے میں کچھ تھا ہی نہیں۔ پھر پاسپورٹ کے دفتر سے نکل کر وہ سیدھے اسٹیشن گیا اور وہاں رات کا کھانا کھایا۔

ادھر فکس جہاز سے اتر کر فوراً بمبئی پولیس کے ہیڈ کوارٹر پہنچا۔ وہاں پہلے تو اس نے سب سے اپنا تعارف کرایا اور پھر دریافت کیا کہ لندن سے چور کی گرفتاری کا کوئی وارنٹ تو نہیں آیا۔ جب اسے 'نہیں' میں جواب ملا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ فکس ہار ماننے والا نہ تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں اس نے بمبئی پولیس سے چور کی گرفتاری کا حکم جاری کرنے کے لئے کہا۔ لیکن پولیس نے صاف انکار کر دیا۔ اسے یقین تھا کہ فلیس فوگ بمبئی سے آگے نہیں جائے گا۔ پھر بھی وہ اسٹیشن گیا تا کہ اس کا شکار کہیں بچ کر نہ نکل جائے۔

ادھر پاس پرٹو سامان خریدنے کے بعد کچھ دیر تک بازار میں گھومتا رہا۔ وہاں ہر قوم کے لوگ تھے۔ کوئی ٹوپی پہنے تھا تو کوئی ہیٹ اور کسی نے سر پر بڑی سی پگڑی باندھ رکھی تھی۔ راستے میں پارسیوں کا ایک رنگ برنگا جلوس ملا۔ وہ تھوڑی دیر تک یہ تماشہ دیکھتا رہا اور پھر اسٹیشن کی راہ لی۔ مالا بار ہل کے قریب اس کی نظر ایک خوبصورت مندر پر پڑی۔ اس نے سوچا کہ اندر چل کر دیکھنا چاہئے۔ وہ ہندوستانی طریقے سے بالکل ناواقف تھا کہ مندر میں جوتے پہن کر داخل نہیں ہو سکتے بلکہ انھیں مندر کے دروازے کے باہر چھوڑنا پڑتا ہے۔ پاسپرٹو جوتے پہنے ہوئے ہی اندر داخل ہو گیا اور گھوم پھر کر مندر کے نقش و نگار دیکھنے لگا۔ اتنے میں تین پنڈت اس پر ٹوٹ پڑے۔ جوتے اور موزے چھین لیے اور اس کی خوب دُرگت بنائی۔ ہٹا کٹا پاسپرٹو کچھ دیر تک خوب ہاتھا پائی کرتا رہا۔ مگر بے چارہ اکیلا تین آدمیوں کا کب تک مقابلہ کرتا؟ سر پر پیر رکھ کر بھاگا اور اسٹیشن جا کر ہی دم لیا۔

8 بجنے میں 5 منٹ پر ٹرین کے روانہ ہونے سے صرف چند منٹ پہلے ننگے پیر اور ننگے سر ہی وہ اسٹیشن پہنچ گیا۔ اس بھاگ دوڑ میں سر سے ہیٹ بھی ہوا ہو چکی تھی۔ اسی دھینگا مشتی میں اس نے سامان کا وہ بنڈل بھی کھو دیا جو بازار سے خرید کر لایا تھا۔ ٹرین کے دروازے پر پہنچ کر اس نے مالک سے سارا احوال سنایا تو فلیس فوگ نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ تم آئندہ ایسی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔'' پھر پاس پرٹو ڈبہ میں اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔

سراغ رساں فکس، برابر فلیس فوگ کا پیچھا کرتا رہا۔ وہ پلیٹ فارم پر پاسپرٹو کے ڈبہ کے قریب ہی ایک طرف کونے میں دبکا کھڑا تھا۔ اس نے یہ سارا قصہ سن لیا۔ دوسرے ڈبے میں سوار ہوتے ہوئے اسے خیال آیا کہ پاسپرٹو نے، ہندوستان کی سرزمین پر ایک جرم کیا ہے، اب اسے گرفتار کروا کر مزہ چکھانا چاہئے، اس طرح ملازم کی خاطر فلیس فوگ کو بھی چند روز ہندوستان میں روکنا پڑے گا۔ فکس فوراً ڈبہ سے اتر پڑا۔ انجن نے ایک زوردار سیٹی دی اور ٹرین آہستہ آہستہ پلیٹ فارم سے روانہ ہو گئی۔

کلکتہ جانے والی ٹرین مسافروں سے بھری تھی۔ فلیس فوگ کے ڈبہ میں آقا اور ملازم کے علاوہ ایک اور مسافر تھا۔ یہ ہندوستانی فوج کا ایک اعلا افسر سرفرانس تھا۔ یہ شخص سویز سے بمبئی تک جہاز کے سفر میں فلیس فوگ کے ساتھ تاش کھیلتا رہا۔ اور اب وہ بنارس اپنی رجمنٹ واپس جا رہا تھا۔

رات میں ٹرین ناسک، مالیگاؤں اور نگ آباد سے ہو کر گزری اور دوسرے دن 21 اکتوبر کو خاندیش (کھنڈوا) کے ہرے بھرے کھیتوں سے گزرنے لگی۔ یہ خوب صورت مناظر دیکھ کر پاسپرٹو کو اپنے وطن فرانس کی یاد آ گئی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ ہندوستان کی سرزمین سے گزر رہا ہے۔

دوپہر کو ساڑھے بارہ بجے ٹرین برہان پور کے اسٹیشن پر رکی تو پاسپرٹو نے خوب صورت ہندوستانی چپل کا جوڑا خریدا جس پر نقلی موتی لگے تھے۔

سفر کے دوران سرفرانس کو سفر کا مقصد معلوم ہو گیا تو وہ بھی اس میں دلچسپی لینے لگا، اور فلیس فوگ سے بولا:

''اگر تم نے اسّی دن میں دنیا کا سفر کر لیا تو تم بہت خوش قسمت ہو گے، کیوں کہ ابھی راستے میں بہت سی رکاوٹیں پیش آئیں گی۔''

''نہیں ایسا نہیں ہو سکتا، بہر حال مجھے اپنی کامیابی کا یقین ہے۔''

پھر سرفرانس نے کہا ''مثال کے طور پر تمہارے ملازم کے ساتھ بمبئی میں جو واقعہ پیش آیا، تمہیں پتہ نہیں کہ انگریزی حکومت ایسے معاملات میں کتنی سخت ہے۔ اس جرم کی پاداش میں تمہارے نوکر کو قید کی سزا دی جا سکتی ہے۔''

''اگر میرا ملازم گرفتار کر لیا جائے اور جوتے پہنے ہوئے مندر میں جانے کی علت میں اسے سزا بھی ہو جائے تو یہ اس کا اپنا ذاتی معاملہ ہو گا۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہ ہو گا۔ اگر اسے کلکتہ میں روک لیا گیا اور جیل میں ڈال دیا گیا تو مجھے افسوس تو ضرور ہو گا لیکن اس سے میرے سفر پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔''

''مگر دوسرا کوئی ایسا حادثہ ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے تمہارے سفر میں دیر ہو جائے۔'' فرانس نے جواب دیا۔

پاسپر ٹو کو یقین نہیں تھا وہ ہندوستان میں ہے

اسی وقت یعنی صبح کے ساڑھے آٹھ بجے، بیچ جنگل میں یکا یک ٹرین کی رفتار کم ہو گئی اور آخر کچھ دور جا کر وہ بالکل رک گئی۔ فلیس فوگ کی نظر خود بہ خود سرفرانس کی طرف اٹھ گئی۔

باہر سے آوازیں آنے لگیں۔ ''تمام مسافر یہاں پر اتر جائیں۔''

پاسپرٹو فوراً ٹرین سے باہر کود پڑا اور چند منٹ بعد واپس آ کر اس نے کہا ''بس یہاں ریل کی پٹری ختم ہو جاتی ہے۔''

سرفرانس نے پوچھا ''کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''یہاں سے آگے ٹرین جا ہی نہیں سکتی۔''

یہ سن کر سرفرانس فوراً ٹرین سے اتر پڑا اور فلیس فوگ بھی اطمینان سے نیچے اتر آیا۔ انھوں نے گارڈ سے پوچھا ''آخر کیا قصہ ہے؟''

گارڈ نے کہا ''یہاں سے کوئی پچاس میل دور الہ آباد تک ابھی ریل کی پٹری نہیں بچھائی گئی ہے۔ الہ آباد سے تمھیں دوسری ٹرین مل جائے گی۔''

سرفرانس نے غصہ میں کہا ''لیکن تم نے تو ہمیں بمبئی سے کلکتہ کا ٹکٹ دیا ہے۔''

''ہاں دیا تو ہے، لیکن سارے مسافر یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہاں سے الہ آباد تک انھیں خود اپنی اپنی سواری کا بندوبست کرنا پڑتا ہے۔'' گارڈ نے جواب دیا۔

سرفرانس غصے سے لال پیلا ہو رہا تھا اور پاسپرٹو کی شکل سے ایسا لگتا تھا کہ اگر اس کا بس چلتا تو وہ گارڈ کو کچا ہی چبا جاتا۔

یہ ساری باتیں سن کر فلیس فوگ نے آہستگی سے کہا ''سرفرانس اگر تم مانو تو ہم الہ آباد تک جانے کے لئے سواری کا کوئی بندوبست کریں۔''

سرفرانس نے جواب دیا ''لیکن مجھے ڈر ہے کہ اس کی وجہ سے کہیں تمہارا سفر چوپٹ نہ ہو جائے۔''

''ہرگز نہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ راستے میں کوئی نہ کوئی رکاوٹ ضرور پیش آئے گی۔ ہم تو یہاں دو دن پہلے ہی پہنچ گئے ہیں اور پھر کلکتہ

سے ہانگ کانگ جانے والا جہاز تو 25 اکتوبر کی دوپہر کو روانہ ہوتا ہے مجھے یقین ہے کہ ہم وقت پر پہنچ جائیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔"

دراصل سارے مسافر یہ جانتے تھے کہ ریل کی پٹری الہ آباد سے پچاس میل پہلے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے ان لوگوں نے الہ آباد پہنچنے کے لئے اپنی اپنی سواری کا بندوبست کر لیا۔ کسی نے بیل گاڑی لی تو کوئی گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ کچھ مسافروں نے گھوڑا گاڑی کرایہ پر لی۔ یہاں تک کہ بعض لوگوں کو سانڈ کی سواری بھی کرنی پڑی لیکن فلیس فوگ اور اس کے ساتھیوں کو کوئی سواری نہ مل سکی۔ اب ان کے لئے پیدل چلنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

فلیس فوگ فضول وقت گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا:

"میں تو یہ فاصلہ پیدل ہی طے کروں گا۔"

پاسپرٹو کچھ دیر سوچنے کے بعد بولا " مالک مجھے ایک سواری مل سکتی ہے۔ ایک ترکیب سوجھی دی ہے۔"

"کیا"، فلیس فوگ نے پوچھا۔

"ہاتھی کی سواری۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک دیہاتی کے پاس ہاتھی مل جائے گا۔"

فلیس فوگ نے کہا "اچھا چلو اس ہاتھی کو دیکھیں۔"

پانچ منٹ بعد وہ تینوں ایک جھونپڑی کے پاس پہنچے۔ جھونپڑی کے اندر دیہاتی بیٹھا تھا اور باہر ایک ہاتھی کھڑا جھوم رہا تھا۔

فلیس فوگ نے جب دیکھا کہ الہ آباد جانے کے لئے اس وقت اور کوئی سواری نہیں مل سکتی تو اس نے ہاتھی کو کرایہ پر لینے کا فیصلہ کیا مگر جب مالک نے پوچھا تو اس نے انکار کر دیا۔ حالانکہ فلیس فوگ فی گھنٹہ دس سے بڑھا کر بیس بلکہ چالیس پونڈ کرایہ دینے کے لئے تیار تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہاتھی کے مالک کو کچھ سو پونڈ کرایہ ملتا کیوں کہ الہ آباد تک پہنچنے میں 15 گھنٹے لگتے تھے۔

جب ساری کوششیں بیکار ہو گئیں تو فلیس فوگ نے ہاتھی کو خرید لینے کا فیصلہ کیا اور شروع میں اس کی قیمت ایک ہزار پونڈ لگائی لیکن مالک نے بیچنے سے صاف انکار کر دیا۔ سر فرانسس نے جب دیکھا کہ فلیس فوگ ہاتھی خریدنے پر تلا ہوا ہے تو اسے ایک طرف کو لے گیا اور سمجھایا کہ ہاتھی کی قیمت بڑھانے سے پہلے وہ اچھی طرح غور کر لے۔

فلیس فوگ کو تو بیس ہزار پونڈ کی شرط جیتنا تھا چاہے اس کے لئے ہاتھی کی اصلی قیمت سے بیس گنا زیادہ قیمت ہی کیوں نہ دینی پڑتی۔ فلیس فوگ نے جواب دیا کہ وہ کسی بات پر دوبارہ کبھی غور نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بار میں فیصلہ کر لیتا ہے۔

فلیس فوگ دیہاتی کے پاس گیا جس کی صورت سے یہ صاف ظاہر تھا کہ سارا کھیل پیسوں کا ہے۔ ہاتھی کا مالک ایک ہزار پونڈ پر راضی نہ ہوا تو فلیس فوگ نے بڑھا کر بارہ سو پونڈ قیمت لگائی۔ پھر پندرہ سو اور پھر اٹھارہ سو پونڈ۔ ہاتھی کا مالک اس پر بھی راضی نہ ہوا تو فلیس فوگ نے آخر تنگ آ کر دو ہزار پونڈ پیش کیے۔

سر فرانسس اور پاسپرٹو خاموش کھڑے یہ سارا تماشا دیکھتے رہے لیکن کسی کو ایک لفظ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر دو ہزار پونڈ پر مالک راضی ہو گیا اور اس طرح فلیس فوگ نے ہاتھی خرید لیا لیکن اب سوال یہ تھا کہ اس کو ہانکنے کے لئے مہاوت کہاں سے آئے؟ خوش قسمتی سے ایک اور دیہاتی اس کام کے لئے تیار ہو گیا۔ فلیس فوگ نے اسے منہ مانگا انعام دینے کا وعدہ کیا بشرطیکہ وہ انھیں جلد سے جلد الہ آباد پہنچا دے۔

دیہاتی بھی چھپا رستم نکلا۔ وہ ایک اچھا مہاوت تھا۔ ہاتھی کی پیٹھ پر دونوں طرف ایک ایک کرسی باندھ کر ہودہ بنا دیا۔ دیہات سے کھانے پینے کا سامان خریدا گیا فلیس فوگ اور سر فرانسس تو کرسیوں پر بیٹھ گئے اور بے چارہ پاسپرٹو، کرسیوں کے بیچ خالی جگہ پر براجمان ہو گیا اور مہاوت ہاتھی کی گردن پر بیٹھ گیا۔ نو بجے وہ سب الہ آباد کے لئے روانہ ہو گئے۔

مہاوت جنگل کے راستوں سے اچھی طرح واقف تھا اس کے باوجود ٹیڑھے میڑھے اونچے نیچے راستوں کی وجہ سے سب کے انجر پنجر

ڈھیلے ہوگئے۔ پاسپرٹو تو سارے وقت اپنی زبان دانتوں کے نیچے آنے سے بچاتا رہا۔ ہاتھی کے مالک کی ہدایت کے مطابق وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد گڑ کے ڈلے تھیلی سے نکال کر ہاتھی کو کھلاتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر آقا الٰہ آباد پہنچ کر اس ہاتھی کا کیا کرے گا؟ کیا وہ اس بھاری بھرکم جانور کو اپنے ساتھ لے جائے گا؟ یہ تو ممکن نہ تھا کیوں کہ اس کی دیکھ بھال کے لئے پانی کی طرح روپیہ بہانا پڑتا۔ تو کیا پھر وہ اسے رہا کردے گا، یا بیچ دے گا؟ ہاتھی کی پیٹھ پر بیٹھ کر ہچکولے کھاتے ہوئے بڑی دیر تک اسے یہی خیالات ستاتے رہے۔

دو گھنٹے بعد، آرام کرنے کی غرض سے تالاب کے قریب ایک سایہ دار درخت کے نیچے سب کچھ دیر کے لئے ٹھہر گئے۔ ہاتھی نے درخت کے پتے کھائے اور تالاب پر سیر ہوکر پانی پیا۔ پاس پرٹو نے اپنے آقا اور سرفرانس کے لئے کھانا بنایا۔ سرفرانس کچھ تھک سا گیا تھا۔ لیکن اس نے دیکھا کہ فلیس فوگ بالکل تازہ دم ہے، جیسے ابھی بستر سے اٹھا ہو۔

ایک گھنٹے بعد وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔ اب وہ وندھیا چل کی پہاڑیوں سے گزر رہے تھے جہاں درختوں پر بیٹھے بندران کا منہ چڑھا رہے تھے۔ انھیں دیکھ دیکھ کر پاسپرٹو مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہورہا تھا اور اس کا بھی جی چاہ رہا تھا کہ ان بندروں کی طرح قلابازیاں لگانا شروع کردے۔

آخر رات کے آٹھ بجے راستے میں انھیں ایک پرانا ڈاک بنگلہ ملا۔ وہ آدھے سے زیادہ فاصلہ طے کرچکے تھے۔ ہاتھی کی تکلیف دہ سواری کی وجہ سے سب تھک کر چور ہوگئے تھے۔ اسی ڈاک بنگلہ میں ان لوگوں نے رات گزاری۔ اندھیری اور سنسان رات میں چیتے اور شیر کے دھاڑنے کی آواز اور بندروں کے شوروغل کے سوا کچھ اور سنائی نہ دیتا تھا۔ ہاتھی ایک درخت کا سہارا لے کر کھڑے کھڑے ہی اپنی نیند پوری کررہا تھا۔ مہاوت اسی کے پاس سو رہا تھا۔

دوسرے دن صبح چھ بجے ہی وہ چل پڑے۔ مہاوت نے یقین دلایا کہ وہ شام تک الٰہ آباد پہنچ جائیں گے۔ دوپہر ڈھلنے کے بعد کوئی چار بجے ہاتھی ایک دم چہل میں آگیا اور تیز دوڑنے لگا۔ ایسا لگتا تھا کہ بس کچھ ہی دیر میں وہ اپنی منزل پر پہنچ جائیں گے۔ لیکن گھنے جنگل میں یکا یک خود بخود ہاتھی کے قدم رک گئے۔

''کیا بات ہے؟'' سرفرانس نے مہاوت سے پوچھا۔

''مجھے بھی پتہ نہیں۔'' مہاوت نے جواب دیا۔

دور، جنگل میں کچھ عجیب عجیب سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ایسا معلوم ہورہا تھا کہ وہ آوازیں قریب آتی جارہی ہیں۔ پاس پرٹو آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ لیکن فلیس فوگ نے کچھ نہیں کہا۔ وہ بڑے صبرو استقلال سے یہ آوازیں سنتا رہا۔

مہاوت فوراً نیچے کود پڑا اور ہاتھ کو گھنی جھاڑیوں میں لے جاکر ایک بڑے پیڑ سے باندھ دیا اور خود چھپ کر اس طرف گیا جدھر سے آوازیں آرہی تھیں۔ پھر کچھ دیر بعد واپس آکر کہنے لگا ''یہاں خطرہ ہے۔ ہمیں فوراً چھپ جانا چاہئے۔ چلو ہم سب جلدی کہیں چھپ جائیں۔'' پھر وہ ہاتھی کو پیڑ سے کھول کر گھنے جنگل میں ایک ایسی جگہ لے گیا جہاں کسی کی نظر اس پر نہ پڑ سکے۔

آوازیں قریب ہوتی گئیں۔ ان لوگوں نے جھاڑیوں سے چھپ کر دیکھا تو دور سے ایک جلوس چلا آرہا تھا۔ گیروے رنگ کے کپڑے پہنے ہوئے کچھ پنڈت آگے آگے تھے اور ان کے پیچھے مرد اور عورت ناچتے گاتے چل رہے تھے۔ اس ٹکڑی کے پیچھے چند آدمی چار پہیوں والے ایک رتھ کو کھینچ رہے تھے۔ جس پر اودے رنگ کی چار ہاتھوں والی ایک بڑی مورتی رکھی ہوئی تھی، اور اس مورتی کے سرخ ہونٹوں کے بیچ سے ایک لمبی سی زبان باہر کو لٹک رہی تھی۔ یہ عجیب منظر دیکھ کر سرفرانس کو حیرت نہ ہوئی۔ اس نے کہا: ''یہ کالی ماتا ہے، محبت اور موت کی دیوی۔''

تبھی مہاوت نے خاموش رہنے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس مورتی کے چاروں طرف سادھو ناچ رہے تھے، جن کے جسم پر پیلا اور اودا رنگ لگا ہوا تھا۔ ان سادھوؤں کے پیچھے سفید لباس پہنے ایک کمزور مگر نوجوان عورت لڑکھڑاتے قدموں سے چل رہی تھی۔ جیسے نشہ کی حالت میں ہو۔ اس کا رنگ سفید تھا اور سارا جسم زیورات سے لدا ہوا تھا۔ عورت کے پیچھے کچھ سپاہی ہاتھوں میں ننگی تلواریں لیے چل رہے تھے اور چار سپاہی ایک بوڑھے راجا کی ارتھی کو اٹھائے ہوئے تھے جسے اسی زرق برق لباس میں لپیٹا گیا تھا۔ جو وہ اپنی زندگی میں پہنا کرتا تھا۔ اس کے سر پر ایک پگڑی تھی جس پر موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ ریشمی لباس پر سنہرا کام تھا اور اس کی کمر سے ہیرے جڑی ہوئی ایک کٹار بندھی تھی۔ اس ارتھی کے پیچھے بھی اور بہت سے لوگ چیختے چلاتے چل رہے تھے۔

جب جلوس آگے نکل گیا اور باجے کی آوازیں کچھ دھیمی ہوگئیں تو سرفرانسس نے مہاوت کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''کیا یہ ستی ہے؟''

مہاوت نے جواب میں سر ہلا دیا تو فلیس فوگ نے پوچھا:

''اس کا کیا مطلب ہے؟''

سرفرانسس نے کہا: ''ستی کا مطلب یہ ہے کہ ایک بیوہ عورت اپنے مردہ شوہر کے ساتھ زندہ جل مرتی ہے۔ وہ عورت جس کو تم نے ابھی دیکھا تھا، وہ اس مردے کے ساتھ صبح سویرے زندہ جلا دی جائے گی۔''

''بے چاری عورت۔'' پاسپر ٹو نے ایک لمبی سانس بھر کر کہا۔

''زندہ جلا دی جائے گی۔ یہ رسم ابھی تک ہندوستان کے کچھ علاقوں میں جاری ہے۔'' مہاوت نے کہا۔

''لیکن کسی بیوہ سے جو برتاؤ کیا جاتا ہے وہ تو اس سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ رشتہ دار اس کا سر منڈوا دیتے ہیں، منحوس سمجھ کر اس کے قریب تک نہیں جاتے اور اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ اسی لیے بعض بیوہ عورتیں اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ جل مرنا پسند کرتی ہیں۔'' سرفرانسس نے کہا۔

پاسپر ٹو نے پوچھا۔ ''پھر وہ مردہ کس کا تھا؟''

''وہ لاش اس عورت کے شوہر کی تھی، جو ایک بڑا راجا تھا۔'' مہاوت نے جواب دیا۔ ''وہ عورت، جس کو ہم نے ابھی دیکھا تھا وہ اپنی مرضی سے جلنا نہیں چاہتی بلکہ اسے زبردستی لے جایا جا رہا ہے اور صبح...'' فلیس فوگ نے بیچ میں ٹوکا ''لیکن یہ سب تمہیں کیسے معلوم؟''

مہاوت نے جواب دیا: ''یہ تو بندیل کھنڈ کا ہر شخص جانتا ہے۔''

یہ سن کر سرفرانسس نے کہا ''وہ تو بچ کر بھاگنے کی بھی کوشش نہیں کر رہی تھی۔''

مہاوت نے جواب دیا ''میں نے سنا ہے کہ وہ بیوہ عورت مرنا نہیں چاہتی۔ اسی لیے اسے بھنگ پلائی گئی ہے جس کی وجہ سے وہ بے ہوش سی ہوگئی اور اب وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ کیا ہونے والا ہے۔''

فلیس فوگ نے پوچھا ''لیکن یہ لوگ اسے کہاں لیے جا رہے ہیں۔''

''یہاں سے دو میل کے فاصلہ پر پلاجی کے مندر۔ وہ اسے صبح تک وہاں رکھیں گے۔''

پھر مہاوت نے ہاتھی کو جھاڑیوں سے باہر نکالا اور اسے آگے ہانکنے لگا تو فلیس فوگ نے اسے روک دیا اور سرفرانسس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ''اگر ہم اس عورت کو بچالیں تو کیا ہوگا؟''

سرفرانسس نے حیرت سے کہا ''اس عورت کو بچالیں؟''

''کیوں نہیں؟ ابھی تو کافی وقت ہے۔ لیکن یہ کام بارہ گھنٹے کے اندر اندر ہو جانا چاہئے۔''

سرفرانسس نے مسکراتے ہوئے کہا ''تو پھر اس کا یہ مطلب ہوا کہ تمہارے پہلو میں بھی ایک دل ہے؟''

فلیس فوگ نے دبی زبان سے کہا ''ہاں، کبھی کبھی، بعض مرتبہ۔ جب میرے پاس فضول وقت ہو۔'' جاری

شبنم پروین

آ گیا ہے امریکہ سے

بیس بال

آج ہم بڑے میدان پر کھیلے جانے والے ایک ایسے کھیل کی بات کریں گے جو یوں تو دنیا کے بہت ہی مقبول کھیلوں میں شمار ہوتا ہے، لیکن ہمارے ملک اور پڑوسی ملکوں کے اس علاقے میں جسے جنوبی ایشیا کہتے ہیں بہت کم لوگ اسے جانتے ہیں۔ اس کھیل کا نام ہے بیس بال Baseball۔ امریکہ میں تو اس کھیل کے لوگ اتنے دیوانے ہیں کہ مشہور فلسفی موریس رافیل کوہن Morris Raphael Cohen نے 1919 میں یہ کہہ دیا تھا کہ بیس بال امریکہ کا قومی مذہب ہے۔

ویسے یہ بڑی عجیب سی بات ہے دوستو کہ بیس بال حالانکہ کرکٹ سے کافی ملتا جلتا ہے کیونکہ اس میں رن بھی بنتے ہیں، بولنگ بھی ہوتی اور بلّے اور گیند کا بھی استعمال ہوتا ہے، یہاں تک کہ کوئی وکٹ نہ ہونے کے باوجود ایک وکٹ کیپر جیسا کھلاڑی بھی بلّے باز کے پیچھے کھڑا رہتا ہے (جسے کیچر Catcher کہتے ہیں) پھر بھی جہاں بیس بال مقبول ہے وہاں کرکٹ نہیں کھیلا جاتا، جیسے امریکہ اور جاپان۔ اور جہاں لوگ کرکٹ کو زیادہ پسند کرتے ہیں وہاں بیس بال کا رواج نہیں ہے، جیسے ہندستان اور انگلینڈ۔

بیس بال 9 کھلاڑیوں کی دو ٹیموں کے درمیان گیند اور بلّے سے کھیلا جاتا ہے۔ اس میں گیند باز 90 فٹ کے چوکور سے رنگ کے بیچوں بیچ، جسے ڈائمنڈ کہتے ہیں، ایک دائرے کے اندر کھڑے ہوکر بڑے کونے پر کھڑے بلّے باز کو دوڑے بغیر گیند پھینکتا ہے۔ اس بولر کو پچر Pitcher کہتے ہیں۔ جس ساڑھے پانچ میٹر کے دائرے میں

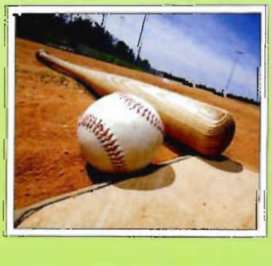

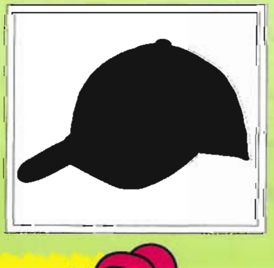

گھوم کر وہ گیند پھینکتا ہے اسے پچرز مونڈ Pitcher's mound کہا جاتا ہے۔ بلّے باز جو کہ ہوم پلیٹ home plate کہلانے والے بڑے کونے میں کھڑے ہو کر گیند کو ہٹ کرتا ہے تو مخالف ٹیم کے کھلاڑی جو پورے میدان کے باقی تین کونوں میں پھیلے رہتے ہیں گیند کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس دوران ڈائمنڈ میں دوڑنے والے کھلاڑی رن بنانے کی کوشش کرتے ہیں، جب کہ فیلڈنگ کرنے والوں کی کوشش ہوتی ہے کہ جلد سے جلد گیند پکڑ کر پچر کی طرف پھینک دیں تا کہ وہ اسے ڈائمنڈ کے کسی ایسے کونے پر پھینک دے جس سے رن بنانے والا کافی دور ہو۔ اگر رن بنانے والا گیند لگنے سے پہلے اپنے کونے پر پہنچ گیا تو ٹھیک ہے ورنہ وہ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ ڈائمنڈ کے یہ کونے بیس کہلاتے ہیں اور اسی سے کھیل کا نام بیس بال پڑا ہے۔ اس کھیل میں چوکے اور چھکّے بھی لگتے ہیں تاہم اسکورنگ کا حساب کرکٹ سے بالکل الگ ہوتا ہے۔ مجموعی طور ایک میچ میں 9 اننگز کھیلی جاتی ہیں اور جو ٹیم ان میں زیادہ پوائنٹ یا رن مجموعی طور پر بنالیتی ہے وہ جیت جاتی ہے۔

بیس بال بالغ مرد کی مٹھی جتنی بڑی یعنی تقریباً 9 انچ یا 23 سینٹی میٹر قطر کی ہوتی ہے۔ اس کا رنگ عام طور سے سفید ہوتا ہے جس پر سرخ دھاگے سے سلائی کی جاتی ہے۔ بلاّ کرکٹ کے بلّے سے کافی مختلف اور گول ہوتا ہے جو آگے سے چوڑا اور ہینڈل کی طرف پتلا ہوتا ہے۔ یہ لکڑی کے ایک ہی ٹھوس ٹکڑے سے بنایا جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا جوڑ نہیں ہوتا۔ کھیل میں استعمال ہونے والی تیسری چیز وہ دستانے یا Mitt ہیں جو فیلڈنگ کرنے والے کھلاڑی پہنتے ہیں تا کہ اس سے گیند پکڑنے میں آسانی ہو۔ ان میں انگلیوں کے بیچ جھلّی سی ہوتی ہے جس سے گیند پکڑنا اور آسان ہو جاتا ہے۔

بیس بال سے ملتا جلتا کھیل اٹھارہویں صدی کے بیچ کے برسوں میں انگلینڈ میں کھیلا جاتا تھا۔ وہاں سے انگلش مہاجرین اسے شمالی امریکہ لے گئے اور وہیں اس نے جدید بیس بال کی شکل اختیار کی۔ 19 ویں صدی کے آخر تک اس نے امریکہ کے قومی کھیل کی حیثیت حاصل کرلی۔ یہیں سے بیس بال کناڈا پہنچا، میکسیکو میں رائج ہوا، اور کیوبا میں بھی کھیلا جانے لگا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں یہ کھیل ہالینڈ، پورٹو ریکو، آسٹریلیا کے کچھ علاقوں،

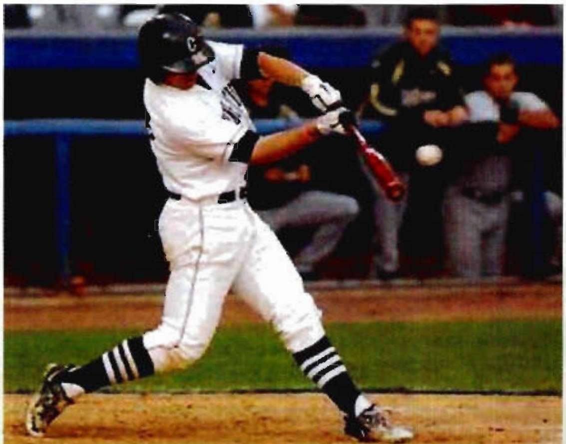

◄بیس بال، دستانہ بلاّ، ہیڈ گیئر ٹوپی، اور کھیل کے کچھ ایکشن◄

▲رنکو سنگھ اور دنیش کمار پٹیل

کیریبیائی ملکوں، وینے زویلا، اٹلی، جاپان وغیرہ میں بھی مقبول ہوگیا۔

1938 میں انٹرنیشنل بیس بال فیڈریشن IBAF کا قیام عمل میں آیا اور آج 117 ملک اس فیڈریشن کے ممبر ہیں۔ ہر چار سال بعد اس کے عالمی کپ مقابلے ہوتے ہیں۔ اس دوران جن ملکوں میں بیس بال زیادہ مقبول تھا وہاں خواتین کی بیس بال ٹیمیں بھی بن گئیں اور پھر ان کے عالمی مقابلے بھی الگ سے ہونے لگے۔ 2004 سے آئی بی اے ایف کی منظوری کے بعد خواتین کے یہ عالمی بیس بال کپ مقابلے منعقد ہو رہے ہیں۔

ہندستان میں بیس بال کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے۔ ہمارے یہاں دسمبر 1983 میں امیچور بیس بال فیڈریشن آف انڈیا Amateur Baseball Federation of India قائم ہوئی تھی اور فروری 1985 میں پہلی نیشنل بیس بال چیمپئن شپ کے مقابلے ہوئے تھے۔ 1987 میں ٹوکیو اور 1989 میں سیول میں ہونے والے ایشین بیس بال چیمپئن شپ مقابلوں میں ہندستانی ٹیم نے بھی حصہ لیا تھا۔ تاہم پہلی اہم کامیابی ہندستانی ٹیم کو 1995 میں منیلا میں ہونے والے ایشین کپ بیس بال چیمپئن شپ مقابلوں میں حاصل ہوئی جب ہماری ٹیم نے کانسے کا تمغہ جیتا تھا۔ اس کے بعد 1999 میں یہ مقابلے چنڈی گڑھ میں ہوئے جس میں ہماری ٹیم دوسرے نمبر پر رہی اور اس نے چاندی کا تمغہ جیت لیا۔ اسی سال اسکول نیشنل گیمز میں بیس بال کو بھی داخلہ دے دیا گیا۔ 2002 میں انڈین اولمپک ایسوسی ایشن نے بھی بیس بال فیڈریشن کو منظوری دے دی 2003 میں اسپورٹس اتھارٹی آف انڈیا SIA نے نیشنل اسکول آف اسپورٹس یا این آئی ایس NIS میں بیس بال کا سرٹیفکیٹ کورس شروع کر دیا۔ اس وقت 26 ریاستوں میں بیس بال کی ایسوسی ایشنیں موجود ہیں اور اب خواتین کی بیس بال ٹیمیں بھی بن رہی ہیں جن کا باقاعدہ قومی چیمپئن شپ مقابلہ بھی ہوتا ہے۔

رنکو سنگھ اور دنیش کمار پٹیل ہندستان کے وہ پہلے بیس بال کھلاڑی ہیں جنھیں امریکہ میں وہیں کی ایک ٹیم میں کھیلنے کے لیے نہ صرف بلایا گیا بلکہ انھیں اس کھیل کی بہت اچھی تربیت بھی دی گئی۔ ان کھلاڑیوں کا انتخاب ایک ریالٹی شو کے ذریعے ہوا اور جیولن تھرو Javelin Throw میں ان کی مہارت کو دیکھ کر سبھی دنگ رہ گئے جو بیس بال کا پچر بننے کے لیے بہت ضروری خیال کی جاتی ہے۔

ابھی اس کھیل کو ہندستان میں کوئی خاص اہمیت اور مقبولیت حاصل نہیں ہے لیکن آنے والے دنوں میں جیسے جیسے اسے ٹیلی ویژن پر اہمیت دی جائے گی اس میں لوگوں کی دل چسپی بھی بڑھے گی کیونکہ اس میں نہ صرف کرکٹ کے عناصر موجود ہیں بلکہ یہ کرکٹ اور خاص طور پر بیس اووروں والے ٹوئنٹی ٹوئنٹی کرکٹ سے بھی زیادہ مزے دار ہے۔ کبھی کسی اسپورٹس ٹی وی چینل پر اس کے کسی میچ کا لائیو ٹیلی کاسٹ دیکھو کتنا مزا آتا ہے!

◆ شبنم پروین، C280، سیکنڈ فلور، شاہین باغ، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

اردو Facebook

میں بچّہ تو نہیں مگر...

میرا نام محمد وقار احمد ہے اور اس وقت بی اے فرسٹ ائیر میں ہوں۔ میرے یہاں ماہنامہ اردو دنیا تو کافی پہلے سے آتا رہا ہے لیکن بچوں کی دنیا کا پہلا شمارہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ میں بچپن کی عمر سے تو نکل چکا لیکن یہ ایک ایسا رسالہ ہے جس میں ڈھیر ساری معلومات بھی ہیں اور اچھی مزیدار کہانیاں بھی۔ مجھے بھی اردو میں نظمیں لکھنے کا شوق ہے۔ میں بھی اپنی تحریریں آپ کو بھیجوں گا۔ میری حوصلہ افزائی کریں گے نا؟

محمد وقار احمد، سلگرڈھیا، مدھوپور، دیوگھر، جھارکھنڈ

◆ آئندہ شمارے سے ہم نئے لکھنے والوں کی کہانیوں اور نظموں کا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ آپ بھی کچھ بھیجئے۔

کامکس اور کہانیاں اچھے لگتے ہیں!

میرے ابو ڈاکٹر قمرالدین اردو دنیا منگاتے ہیں۔ جب اس کا پہلا شمارہ آپ نے بھیجا تو انھوں نے مجھے گھر میں آواز دی کہ بیٹا ادھر آؤ تمھارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔ میں نے جب بچوں کی دنیا اپنے ھاتھ میں لی تو مجھے لگا کہ اس سے اچھا تحفہ تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ میں بہت خوش ہوں۔ اس میں آپ نے چڑیا گھر کی سیر کرائی ہے۔ کامکس بھی دیے ہیں اور ہمارا کالم بھی ہے۔ مجھے ویسے بھی ٹی وی پر کارٹون دیکھنا بہت پسند ہے۔ بچوں کی دنیا کے سارے کامکس اور کہانیاں بہت اچھے لگتے ہیں۔

سدرہ قمر وش، کریم گنج، بھدریہ، گیا، بہار

ہمارے گھر میں اردو ہی لکھی پڑھی اور بولی جاتی ہے

میں صائم خرم اینڈریوز گنج نئی دہلی کے کیندریہ ودیالیہ، اسکول کے درجہ 7 میں پڑھتا ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' کا پہلا اور دوسرا شمارہ دیکھا۔ یہ رسالہ شائع کر کے آپ نے ہم بچوں پر احسان کیا ہے۔ میرے ابو بھی اردو زبان و ادب کے ایک اہم ادارے سے وابستہ ہیں اور گھر میں اردو زبان کے ڈھیر سارے رسالے آتے ہیں۔ ہمارے گھر میں اردو ہی لکھی پڑھی اور بولی جاتی ہے۔ میرا یہ خط آپ اپنے رسالے میں شامل کر دیں گے تو مجھے بے حد خوشی ہوگی۔ بچوں کے شمارے میں اسلامیات سے متعلق بھی کچھ چیزیں شائع کریں۔

صائم خرم، کیندریہ ودیالیہ، اینڈریوز گنج، نئی دہلی 24

قومی اردو کونسل کا عمدہ تحفہ

میں نئی دہلی کے کیندریہ ودیالیہ، اینڈوریوز اسکول میں درجہ 4 میں پڑھتا ہوں۔ بچوں کی دنیا کے کچھ شمارے دیکھنے کو ملے۔ بہت اچھی میگزین ہے۔ اس میں اچھی اچھی کہانیاں، مضمون، کھیلوں کی دنیا، کارٹون وغیرہ ہوتے ہیں۔ قومی اردو کونسل نے 'بچوں کی دنیا' میگزین شائع کر کے ہم بچوں کو ایک اچھا تحفہ دیا ہے۔ اردو کے تعلق سے ہمارے گھر کا ماحول بھی اچھا ہے جہاں سبھی لوگ زیادہ تر اردو ہی میں لکھتے، پڑھتے، اور گفتگو کرتے ہیں۔ اب 'بچوں کی دنیا' کے آجانے سے انشاء اللہ اس میں مزید اضافہ ہوگا۔

شافع خرم، کیندریہ ودیالیہ، اینڈریوز گنج، نئی دہلی 24